الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اپنی ناکامی کا الزام دوسرے پر ڈالنا آسان ہے
مشکل صرف یہ ہے کہ
ایسا الزام کسی پر واقع نہیں ہوتا

شمارہ ۱۶۴

جولائی ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قران کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۴ جولائی ۱۹۹۰

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

آخری انجام

جنرل نوریگا (Manuel Antonio Noriega) نے پناما میں فوجی انقلاب کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ پناما کے ڈکٹیٹر بن گئے۔ انھوں نے اقتدار کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بے شمار دولت اور جائداد اکٹھا کرلی۔ مگر اپنی پالیسیوں سے انھوں نے امریکہ کو ناراض کرلیا۔ امریکہ نے دسمبر ۱۹۸۹ میں پناما میں اپنی فوجیں داخل کردیں۔ جنرل نوریگا اپنا عالی شان محل چھوڑ کر بھاگے اور ویٹیکن کے سفارت خانہ میں پناہ لی۔ مگر یہ پناہ ان کے کام نہ آسکی۔ امریکہ نے ویٹیکن پر دباؤ ڈالا۔ یہاں تک کہ اس نے ۳ جنوری ۱۹۹۰ کو جنرل نوریگا کو امریکی سپاہیوں کے حوالے کردیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ جنوری ۱۹۹۰)

۳ جنوری کا وہ منظر بہت عبرت ناک تھا جب جنرل نوریگا ویٹیکن مشن سے ایک ہارے ہوئے انسان کی حیثیت سے باہر نکلے اور امریکی سپاہیوں نے فوراً ہی ان کے ہاتھ کو ہتھکڑیوں میں جکڑدیا۔ اے پی کے رپورٹر کے الفاظ میں، جنرل نوریگا کا خاندان، دوست، محبت کرنے والے، دولت اور پسند کرنے والوں کی بھیڑ سب ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کل تک جو شخص ایک طاقت ور انسان تھا، آج اس کے لیے دنیا میں کوئی جگہ نہ تھی جہاں وہ جاسکے۔

ایک مبصر کے الفاظ میں، جنرل نوریگا کو شاید ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک اندھیری سرنگ میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ مشن کی عمارت میں بھی تنہا تھے اور اس کے باہر بھی تنہا۔ ان کے میزبانوں نے انھیں یاد دلایا کہ وہ ان کے یہاں صرف ایک ناپسندیدہ مہمان تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے جنرل نوریگا ویٹیکن مشن کے ایک بند کمرہ میں خاموش پڑے ہوئے تھے۔ یہاں ان کے کان ایسے گانے سننے پر مجبور تھے جس میں کہا گیا تھا کہ اب تمہارے لیے کہیں بھاگنے کی جگہ نہیں، تمہارے لیے چھپنے کا کوئی مقام نہیں:

No where to run, Nowhere to hide.

جنرل نوریگا کی یہ کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ جو کچھ جنرل نوریگا کے ساتھ اس دنیا میں پیش آیا، وہی تمام انسانوں کے ساتھ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ ہر آدمی بالآخر گرفتار ہو کر خدا کی عدالت میں حاضر کیا جانے والا ہے۔ ہر آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ ہر آدمی کو یہ صورتِ حال پیش آنی ہے کہ وہ محسوس کرے گا کہ میرے لیے نہ بھاگنے کی کوئی صورت ہے اور نہ چھپنے کی کوئی جگہ۔

مقابلہ کی ہمت

۶ جنوری ۱۹۹۰ کے اخبارات جو خبریں لائے، ان میں سے ایک خبر یہ تھی کہ اظہر الدین کو اتفاق رائے سے قومی ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا ہے۔ وہ نیوزی لینڈ جانے والی انڈین کرکٹ ٹیم کے لیڈر ہوں گے۔ یہ بات کرکٹ حلقوں کے لیے انتہائی تعجب خیز تھی۔ کیوں کہ عام خیال تھا کہ یہ عہدہ سری کانت کو دیا جائے گا جو شارجہ کپ، نہرو کپ اور پاکستان کے دورہ پر جانے والی حالیہ ٹیم کے کپتان رہے ہیں۔ ۲۷ سالہ اظہر الدین حیدر آبادی کو کرکٹ میں ان کی مہارت کی وجہ سے ونڈر بوائے (wonder boy) کہا جاتا ہے۔ اظہر الدین ہندستانی کرکٹ کے دوسرے کم عمر کپتان ہیں۔ ان سے قبل منصور علی خان پٹودی ۲۱ سال کی عمر میں قومی ٹیم کے کپتان بنائے گئے تھے۔

اظہر الدین کو جس چیز نے اس اعلیٰ عہدے پر پہونچایا، وہ ان کی یہ صلاحیت ہے کہ چیلنج پیش آنے پر وہ بے ہمت نہیں ہوتے۔ بلکہ مزید طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۹ میں دورۂ پاکستان کے آغاز میں اظہر الدین کا ٹسٹ کیریر خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ کیوں کہ فیصل آباد ٹسٹ کی پہلی باری میں وہ کوئی خاص اسکور نہ کر سکے تھے۔ بلکہ صفر پر ہی آوٹ ہو گئے تھے۔ لیکن دوسری باری میں شاندار سنچری بنا کر انھوں نے اپنا ٹسٹ کیریر تباہ ہونے سے بچا لیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۶ جنوری ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، سلکشن کمیٹی کے چیرمین مسٹر راج سنگھ دونگر پور نے کہا کہ اظہر الدین کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کو محبوب رکھتے ہیں، جیسا کہ پاکستان کے دورہ میں دیکھا گیا جہاں وہ پہلے ٹسٹ میں چنے نہ جانے کے قریب پہونچ گئے تھے۔ اور یہ قیادت کی نہایت اہم خصوصیت ہے:

He loves getting out of challenging situations, as was seen on the tour of Pakistan where he was on the verge of being dropped from the first Test, and that's an important ingredient in leadership.

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو چیلنج کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ یہ صفت کسی آدمی کے اندر جتنی زیادہ ہو گی اتنی ہی زیادہ بڑی کامیابی وہ اس دنیا میں حاصل کرے گا۔

ایک جائزہ

ظہیرالدین محمد بابر (۱۵۳۰ - ۱۴۸۳) نے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۵۱۹ میں برصغیر ہند میں داخل ہوا۔ مختلف لڑائیوں کے بعد آخر کار ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے مغل سلطنت کا آغاز کیا۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔

جلال الدین محمد اکبر (۱۶۰۵ - ۱۵۴۲) ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۶ میں وہ مغل تخت پر بیٹھا۔ اس وقت مغل سلطنت ایک غیر مستحکم سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغلوں کی حیثیت ایک بیرونی حملہ آور کی تھی اور اس بنا پر یہاں کے قدیم باشندوں میں ان کے خلاف ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اس ناراضگی کو ختم کرنے کے لیے اکبر نے وہ تدبیر کی جو عام طور پر دین الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ دین الٰہی حقیقۃً کوئی دین نہ تھا، وہ ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اپنے ظاہری بھونڈے پن کے باوجود یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اکبر اس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اپنے سیاسی استحکام کے لیے ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کر سکے۔

اکبر نے یہ کام اگرچہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے کیا تھا۔ مگر جب ملک میں ہندو مسلم نفرت ختم ہوئی تو اس کا فائدہ اسلام کو بھی پہونچنے لگا۔ لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے۔ اکبر سے لے کر شاہجہاں تک لاکھوں کی تعداد میں مقامی باشندے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس میں سب سے بڑا دخل اسی معتدل فضا کا تھا جو اکبر کی پالیسی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔

اکبر کی نیت کے بارہ میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تاہم اگر بالفرض وہ اتنا ہی برا ہو جتنا کہ کچھ لوگ اس کو سمجھتے ہیں، تب بھی ہمارے مذکورہ تجزیہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اکبر کی میل ملاپ کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نتیجہ کی حد تک یہ واقعہ بدستور مسلّم ہے۔ البتہ اگر وہ بالفرض ایک غلط آدمی رہا ہو تو اس کا معاملہ اس حدیث کے تحت شمار کیا جائے گا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ:

ان اللّٰہ لیؤید ھذا الدین برجلٍ   بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی کے ذریعہ

بھی کرے گا۔

آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوبارہ خراب ہو گیے۔ اورنگ زیب نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے راجپوت، مراٹھا اور سکھ، ہر اک کو اپنا مخالف بنالیا۔ حتی کہ عام ہندو بھی اس کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں از سرنو کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اسلام کے پھیلنے کا جو عمل اکبر کے بعد اپنے آپ جاری ہوا تھا، وہ رک گیا۔ ہندو مسلم منافرت کی بنا پر وہ معتدل ماحول ختم ہو گیا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔

اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صوفیاء کو کھڑا کیا۔ سارے ملک میں صوفیاء اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گیے۔ ان کا خاص مقصد لوگوں کو محبت کا پیغام دینا تھا۔ صوفیاء کو اپنے اس مشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں شامل ہو گیے۔ یہاں تک کہ صوفیاء ہی سماج کا وہ عنصر بن گیے جو سماج کے اوپر سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا اور لوگوں کے مزاج کی تشکیل کرتا تھا۔

بابر کی پیدا کی ہوئی نفرت کو اکبر نے ختم کیا تھا، اورنگ زیب کی پیدا کی ہوئی نفرت کو صوفیاء نے ختم کیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ معتدل فضا قائم ہو گئی جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغل سلطنت پر زوال آگیا، مگر اسلام کی اشاعت تیزی سے جاری ہو گئی۔ اس دور میں دوبارہ لاکھوں لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیے۔

اسلام کی اشاعت کا یہ عمل بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر محمد علی جناح (۱۹۴۸ - ۱۸۷۶) کا ظہور ہوا۔ انھوں نے دو قومی نظریہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں سے الگ ہیں اور مسلمان ہندوؤں سے الگ۔ یہ علحدگی اگر صرف اعتقادی معنوں میں ہوتی تو اس سے کوئی خاص خرابی نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے اس علحدگی کو جغرافی مفہوم دیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور مقابلہ آرائی ایک مستقل سیاسی اصول بن گیا۔

دو قومی نظریہ حقیقتۂ دو قوموں کے درمیان نفرت کے ہم معنی تھا۔ مخصوص اسباب کے تحت اس نظریہ کو مسلمانوں کے درمیان زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ پورے ملک میں دو قومی نفرت کی

ایک نئی فصل اُگ آئی۔ ہندو مسلم نفرت ہی دونوں فرقوں کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اس زہریلی سیاست کی تکمیل ۱۹۴۷ میں ہوئی جب کہ پاکستان کی صورت میں دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی ہوگئی جو دیوار برلن سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔

بیسویں صدی کے وسط سے دوبارہ اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسٹر جناح کی وہ سیاست ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا کر دی۔ اب دوبارہ زمین و آسمان کو کسی ایسے دن کا انتظار ہے جب کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کا یہ ماحول ختم ہو اور اسلام کی اشاعت کا دروازہ دوبارہ کھل جائے جس طرح وہ اس سے پہلے کھلا ہوا تھا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ تحریف سے پاک ہے۔ لمبی تاریخ کے نتیجہ میں وہ ایک قائم شدہ دین بن چکا ہے۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اب اس کے اندر یہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلے۔ وہ خود اپنے زور پر انسانوں کے دلوں میں داخل ہو۔ خود بخود اشاعت کے اس عمل میں واحد رکاوٹ یہ ہے کہ اسلام اور اس کی مدعو قوموں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو جائے۔ اسلام کی اشاعت کے لیے اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے ایسی غیر موافق فضا پیدا نہ ہونے دیں۔ اگر مسلمان صرف اتنا کر سکیں تو اسلام اپنے آپ لوگوں کے اندر نفوذ کرنے لگے گا۔ اس کے بعد اسلام کی توسیع و اشاعت کے لیے کسی براہ راست جدوجہد کی ضرورت نہیں۔

تبلیغی جماعت کا اصل نشانہ اگرچہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ہے۔ مگر اس کے ذریعہ سے منافرت کو ختم کرنے کا وہ کام بالواسطہ طور پر انجام پا رہا ہے جو اس سے پہلے صوفیار کے ذریعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر انجام پایا تھا، اگر یہ عمل قابل لحاظ حد تک بڑھ جائے تو ان شاء اللہ اشاعت اسلام کا رکا ہوا کام دوبارہ ملک میں جاری ہو جائے گا۔

سب سے بڑی ضمانت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ والے لوگ اللہ کے محبوب ہیں (التوبہ ۳٦) ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ غم (الاعراف ۳۵) ان کے لئے خدا آسانی پیدا کرتا ہے (اللیل ۵) ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے (آل عمران ۱۷۲) ان کے لئے زمین و آسمان کی برکتیں کھول دی جاتی ہیں (الاعراف ٩٦) ان کو اللہ کی خصوصی مدد ملتی ہے (آل عمران ۱۲۵) ان کے لئے اللہ گنجائش اور کشادگی پیدا کرتا ہے (الطلاق ۲) ان کے معاملات میں آسانی پیدا کی جاتی ہے (الطلاق ۴) وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں (النور ۵۲) انجام کار صرف ان کے لئے ہے (القصص ۸۳) وغیرہ۔

تقویٰ اہل ایمان کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مخالفوں اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ تقویٰ سے یہ عظیم فائدے کس طرح حاصل ہوتے ہیں، اس کے لئے مندرجہ ذیل روایت پر غور کیجئے:

ان عمر بن الخطاب سأل اُبَیَّ بن کعب عن التقویٰ۔ فقال له اما سلکت طریقاً ذا شوك۔ قال بلیٰ۔ قال فما عملتَ۔ قال شمرت و اجتهدت۔ قال فذالك التقویٰ۔

تفسیر ابن کثیر ۱/۴۰

حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جہاں کانٹے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دامن سمیٹ لئے اور خوب بچ بچ کر چلا۔ انھوں نے کہا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

ابن المعتز نے تقویٰ کے اسی مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها وکبیرها ذاك التقیٰ   واصنع کماش فوق ارض الشوك یحذر ما یریٰ

تقویٰ یہ ہے کہ تم چھوٹے اور بڑے گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور کانٹے دار زمین پر چلنے والا جس طرح بچ بچ کر چلتا ہے، اسی طرح تم بھی کرو۔

تقویٰ (و ق ی) کا اصل مفہوم بچاؤ ہے۔ یعنی اذیت اور ضرر والی چیزوں سے بچ کر رہنا (مفردات راغب اصفہانی) نجات اور کامیابی کو تقویٰ کے عمل سے وابستہ کر کے اللہ تعالیٰ نے زندگی

کا اہم ترین راز بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کو حاصل کرنے کی سب سے ضروری شرط ناکامی کے اسباب سے بچنا ہے۔ اس دنیا میں فائدہ اپنے آپ آرہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی ان نقصان والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو آتے ہوئے فائدے کو اس کی طرف آنے میں مانع بن جائیں۔

گویا فائدہ اور کامیابی کا معاملہ عین وہی ہے جو سورج کا معاملہ ہے۔ سورج کی روشنی اپنے آپ ہر آدمی کی طرف بے پناہ مقدار میں آرہی ہے۔ آدمی کے ذمہ جو کام ہے، وہ صرف یہ کہ وہ اپنے اور سورج کی روشنی کے درمیان کسی چیز کو آڑ یا رکاوٹ نہ بننے دے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے بھی آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے جو آنے والی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہوں۔ آدمی نے اگر اس کا اہتمام کر لیا تو کامیابی اس کی طرف آکر رہے گی۔ وہ کسی حال میں رکنے والی نہیں۔

اس تقویٰ کا ایک پہلو یہ ہے کہ نفس اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اور ان سے دور رہتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ مثلاً خدا کی یاد سے غافل ہونا۔ آخرت کی پکڑ سے نہ ڈرنا، خدائی حدوں کو توڑنا، اخلاق اور معاملات میں من مانی کارروائی کرنا۔ مخلوقات کی پرستش میں مبتلا ہونا، اس قسم کی تمام چیزیں انسان کو گھاٹے میں ڈالنے والی ہیں۔ وہ آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔ جو ایسا کرے گا وہی جنت میں پہنچے گا۔

یہ تقویٰ جو اہل ایمان کے لئے آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہی ان کی دنیا کی کامیابی کا ضامن بھی ہے۔ جو متقیانہ روش ان کی آخرت کو سنوارتی ہے، وہی ان کی دنیا کو سنوارنے کا بھی یقینی ذریعہ ہے۔

اس دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں اور شریر لوگ بھی۔ یہ شریر لوگ بدکلامی کریں گے۔ وہ طرح طرح سے تکلیف پہنچائیں گے۔ وہ اشتعال انگیز کارروائیاں کریں گے۔ وہ اسلام کے خلاف سازشیں کریں گے۔ وہ ایسے کام کریں گے جن سے اہل ایمان کے جذبات میں برہمی پیدا ہو جائے۔ مگر ایسے تمام مواقع پر اہل ایمان کو ہمیشہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہنا ہے۔ برے انسان ان کی راہ میں کانٹے بچھائیں گے، مگر انھیں ان کانٹوں سے بچ کر اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز کانٹوں سے بچنا ہے نہ کہ کانٹوں سے الجھنا۔

دین میں تحریف

قدیم زمانہ ماتھالوجی (mythology) کا زمانہ تھا۔ اس کے تحت مشرک قوموں میں تجسد یا تجسیم (incarnation) کا عقیدہ رائج ہو گیا۔ مثلاً رومی اور یونانی سورج کو دیوتا قرار دے کر اس کو پوجتے تھے اور اس کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس عقیدہ کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ عزیر اور مسیح کو پیغمبر کہنا انھیں رومیوں اور یونانیوں کے خدائی باپ (divine fatherhood) کے نظریہ کے مقابلہ میں کمتر محسوس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ مشرک قوموں کی زبان کو اپنا کر وہ کہنے لگے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مسیح خدا کے بیٹے ہیں (التوبہ ۳۰)

قرآن میں اس مذہبی تقلید کو مضاہاۃ کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ یہود و نصاریٰ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اللہ انھیں غارت کرے، یہ لوگ اپنی گمراہی میں کدھر بھٹکے جا رہے ہیں (التوبہ ۳۰)

مضاہاۃ کی یہ گمراہی موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں مسلمانوں کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ وہ ہے اسلام کو "نظام" کی اصطلاحوں میں بیان کرنا۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کے بہت سے لوگ نظامی طرز فکر سے متاثر ہیں۔ مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی گمراہی ہے جس میں پچھلی امتیں گمراہ قوموں کے زیر اثر مبتلا ہوئیں۔

موجودہ زمانہ میں سوشلزم اور ڈیموکریسی جیسے سماجی اور سیاسی نظریات ظاہر ہوئے۔ ان کے اثر سے یہ ہوا کہ جدید انسان نظامی انداز میں سوچنے لگا۔ فرد کی نجات اُس کو اس میں نظر آنے لگی کہ اجتماعی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ دوبارہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کو اسلام کا روایتی تصور کمتر دکھائی دینے لگا۔ انھوں نے اپنے آپ کو وقت کے ہم سطح بنانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک سیاسی نظام ہے۔ وہ اجتماعی انقلاب کا علمبردار ہے، وغیرہ۔

وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں انقلابی تفکیر کہا جاتا ہے۔ وہ مبنی بر نظام (system-based)

تفکیر ہے۔ مگر اسلامی تفکیر، اس کے برعکس، مبنی بر فرد (individual-based) تفکیر ہے۔ اسلامی دعوت کا نشانہ نظام نہیں ہوتا۔ اسلامی دعوت کا اصل نشانہ فرد ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق، نظام کو نشانہ بنا کر تحریک چلانا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ کیونکہ نظام بذات خود کوئی چیز نہیں۔ اس دنیا میں فرد سے نظام بنتا ہے، نظام سے فرد کی تشکیل نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانہ میں "نظامی" انداز کی نام نہاد اسلامی تحریکوں سے اسلام کو بے پناہ نقصانات پہونچے ہیں۔ اس کا پہلا نقصان یہ ہے کہ قرآن کی وہ تمام آیتیں جن میں فرد کی شعوری اور روحانی غذا تھی، اس کو غلط تفسیر کے ذریعہ نظام اور خارجی انقلاب سے جوڑ دیا گیا۔ سیاست بلاشبہ اسلام کا ایک جزء ہے۔ مگر سیاسی مسئلہ کا ان آیتوں سے کوئی تعلق نہیں جن سے اس مسئلہ کو انتہائی جسارت کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔

مثلاً قرآن میں حکم تھا کہ وربّك فكبّر (اپنے رب کی تکبیر کر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عظمت کا اعتراف کر۔ اللہ کی عظمت وکبریائی کو اپنے دل و دماغ میں اتار لے۔ مگر نظام پسند ذہن نے اس کی سیاسی تفسیر کر ڈالی۔ یہ کہہ دیا گیا کہ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی سیاسی بڑائی قائم کر دو۔ سیاست کے ایوان پر خدائی اقتدار کا جھنڈا لہرا دو۔ اسی طرح بہت سی دوسری آیتوں کی غلط تفسیر کی گئی۔

اس طرح کی تفسیریں بلاشبہ مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) ہیں۔ مزید یہ کہ ان تفسیروں نے تواضع کے دین کو سرکشی کا دین بنا دیا ہے۔ انھوں نے امت کے افراد میں تعمیری ذہن کے بجائے تخریب کاری کا ذہن ابھارا ہے۔ جو دین خوف خدا پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ان تحریکوں کے نتیجہ میں بے خوفی کا مزاج پیدا کرنے کا کارخانہ بن گیا ہے۔

اسلامی شناخت

ہندستان کی فرقہ پرست ہندو جماعتیں اگر یہ مطالبہ کریں کہ مسلمان اکثریت کا لباس (مثلاً دھوتی کرتا) پہنیں یا دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کریں تاکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہو، تو تمام مسلم رہنما چیخ اٹھیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ ہمارے قومی تشخص کو ختم کرنے کی اسکیم ہے، اور ہم کبھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔

یہ قومی تشخص کے بارہ میں مسلم رہنماؤں کی حساسیت کا حال ہے۔ مگر یہی رہنما اسلامی تشخص کے بارہ میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اسلامی تشخص کو ختم کر رکھا ہے، مگر اس کے بارہ میں ہمارے رہنما کوئی مہم نہیں چلاتے۔ شاید اس لیے کہ "قومی تشخص" کے لیے خطرہ غیر قوم کی طرف سے ہے، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی جاسکتی ہے۔ مگر "اسلامی تشخص" کو مٹانے والے خود مسلمان ہیں، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کرنا ممکن نہیں۔

اسلامی تشخص کے پہلو سے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ لغو بات کو سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں (القصص ۵۵ نیز الفرقان ۷۲) اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ نادان لوگ جب برے قول کے ذریعہ ان کے خلاف نادانی کرتے ہیں تو وہ برے قول کے ساتھ ان کا جواب نہیں دیتے۔ بلکہ وہ ان کو معاف کر دیتے ہیں اور ان سے درگزر کرتے ہیں۔ وہ بھلی بات کے سوا اور کچھ نہیں کہتے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تھا کہ جاہل کی شدت صرف آپ کے حلم اور بردباری کو بڑھاتی تھی (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۲۵-۳۲۴)

یہی بات دوسری جگہ اس طرح کہی گئی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں کہ جب کسی لغو اور بے ہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اس سے گزر جاتے ہیں (الفرقان ۷۲) اس کی تشریح مقاتل نے یہ کی ہے کہ اہل ایمان جب کافروں سے گالی اور اذیت کی بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس سے درگزر کرتے ہیں (واذا اسمعوا من الكفار الشتم والاذى اعرضوا وصفحوا، التفسير المظہری، المجلد السابع، صفحہ ۵۴)

ان آیات اور اس طرح کی دوسری آیتوں اور حدیث کے مطابق، اہل ایمان کا اسلامی تشخص یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح سب وشتم کرنے والوں سے الجھتے نہیں، بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرتے

ہیں۔ وہ ایسے مقام سے متانت کے ساتھ گزر جاتے ہیں جہاں ان کے خلاف اذیت ناک باتیں کی جارہی ہوں۔

اب اس قرآنی حکم کی روشنی میں جائزہ لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اس اعتبار سے اپنا اسلامی تشخص بالکل کھو دیا ہے۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی اسلامی شناخت کو باقی نہیں رکھا ہے۔

اس ملک میں بار بار ایسا ہو رہا ہے کہ ہندستان کی غیر مسلم اکثریت کے لوگ اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ وہی فعل کرتے ہیں جس کو قرآن میں "جہالت" کہا گیا ہے۔ وہ اپنا جلوس اس سڑک سے لے جاتے ہیں جو کسی مسلم محلہ سے گزرتی ہو۔ وہ اپنے جلوس میں ایسے نعرے لگاتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے اذیت کا باعث ہوں۔

ایسے موقع پر مسلمان کیا کرتے ہیں۔ وہ جلوس کو روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے نعروں پر مشتعل ہو کر مختلف قسم کی جوابی کارروائیاں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ ردعمل سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ جس موقع پر قرآن نے واضح طور پر صبر واعراض کا حکم دیا ہے، وہاں وہ جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں نے اس معاملہ میں اپنے اسلامی تشخص کو مکمل طور پر ختم کر رکھا ہے۔

یہ بلاشبہ لباس کے معاملہ میں اپنے قومی تشخص کو چھوڑنے سے بہت زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔ مگر یہاں تمام مسلم رہنما خاموش ہیں۔ ان مواقع پر وہ مسلمانوں سے نہیں کہتے کہ تم قرآنی حکم پر قائم رہو اور اس معاملہ میں اپنی اسلامی شناخت کو نہ چھوڑو۔

موجودہ مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ قومی شناخت بمقابلہ ہندو کے تحفظ پر خوب بولتے ہیں، مگر اسلامی شناخت بمقابلہ مسلمان کے مسئلہ پر کچھ نہیں بولتے۔ رہنماؤں کی یہ کوتاہی بلاشبہ جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی اس روش سے وہ موجودہ مسلمانوں کے درمیان اپنی مقبولیت کو باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔ مگر سخت اندیشہ ہے کہ ان کی یہ روش خدا کے یہاں ان کو غیر مقبول بنا دے۔ اور پھر کوئی بھی لفظی مہارت ان کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہ ہو۔

بے حسی کا مرض

انسانی بیماریوں میں ایک ڈراؤنی قسم کی بیماری وہ ہے جس کو جذام (leprosy) کہا جاتا ہے۔ یہ مہلک بیماری ایک مخصوص جراثیم کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ جراثیم جسم کے محیطی اعصاب کو برباد کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر حساسیت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے:

It is caused by Hansen's bacillus. Destruction of the peripheral nerves by the bacillus leads to a loss of sensation. (VI/159)

مثلاً جذام کے مریض کا ہاتھ اگر آگ پر پڑ جائے تو ہاتھ جلتا رہے گا مگر وہ اپنے ہاتھ کو آگ سے ہٹانے کے لیے حرکت میں نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہی حساسیت کا خاتمہ ہے۔ آدمی کے جسم میں باریک قسم کے نازک اعصاب ہوتے ہیں۔ یہ اعصاب بے حد حساس ہوتے ہیں۔ جسم کے کسی حصہ میں کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ اسی وقت اس کی خبر دماغ کو پہونچاتے ہیں۔ دماغ فوراً اس حصۂ جسم کو مقام حادثہ سے ہٹانے کا حکم دیتا ہے۔ اور ایک لمحہ میں جسم کا وہ حصہ وہاں سے ہٹالیا جاتا ہے۔ جذام کے مریض کے اندر یہ مخصوص اعصاب مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اس کا ہاتھ آگ پر پڑ جائے تو دماغ تک اس کی خبر نہیں پہونچ سکے گی، اس لیے دماغ کا حکم بھی جاری نہیں ہوگا۔ اور وہ ہاتھ جلتے رہنے کے باوجود وہیں پڑا رہے گا۔

یہ جسمانی بیماری ایک خدائی نشانی ہے جو ہم کو ایک روحانی بیماری کی پہچان کراتی ہے۔ یہ روحانی بیماری وہی ہے جس کو قرآن میں قساوت (الحدید ۱۶) کہا گیا ہے۔ یہ اخلاقی اور روحانی موت کی ایک حالت ہے جب کہ برائی اور اچھائی کے بارہ میں آدمی کی حساسیت مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس قلبی تڑپ سے محروم ہو جاتا ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ جب وہ بھلائی کو دیکھے تو اس کی طرف دوڑے اور برائی کو دیکھے تو اس سے بھاگ کر اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

ایمانی حساسیت سے اس محرومی کی مثالیں قرآن وحدیث میں کثرت سے بتائی گئی ہیں۔ مثلاً غزوہ بنی المصطلق (۶ھ) کے بعد ایک سادہ واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے خلاف ایک جھوٹا قصہ گھڑا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بلاتحقیق اس کو ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر قرآن میں کہا گیا کہ جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل کر رہے تھے، اور اپنے منھ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے (النور ۱۵)

کسی شخص کے بارہ میں ایک بری خبر سن کر اس کو بلاتحقیق پھیلانے لگنا، حساس دل کے لیے نہایت سنگین بات ہے۔ مگر جن لوگوں کی روحانی موت ہو چکی ہو، وہ اس کو بے تکلف چھاپنا اور نقل کرنا شروع کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ، جذام کے مریض کی طرح، ان کی وہ حساسیت ختم ہو چکی ہوتی ہے جو اس طرح کے معاملہ میں انھیں چونکائے اور ان کو یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ مایکون لنا ان نتکلم بھذا (ہم کو حق نہیں کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں) النور ۱۶۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتا، حالاں کہ اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے (إنّ العَبدَ ليتكلّمُ بالكلمةِ من سَخَطِ اللهِ تعالى لا يُلقِي لها بالاً يهوي بها في جهنّم)

ایک بات جس سے کسی کی آبروریزی ہوتی ہو، کسی کے اوپر جھوٹا الزام عائد ہوتا ہو۔ اس سے کسی کی کردارکشی ہو رہی ہو، اس قسم کی بات اپنی زبان سے نکالنا ایسے آدمی کے لیے ہمالیہ پہاڑ سر پر اٹھانے کے برابر ہے جس کا دل خوفِ خدا سے کانپ رہا ہو۔ مگر جس آدمی کے اندر احتسابِ خداوندی کا احساس مردہ ہو جائے وہ ایسی باتوں کو اس طرح دہرائے گا جیسے وہ کوئی پُرلطف قصہ بیان کر رہا ہے۔

جذام کی بیماری جسمانی حساسیت کھونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر ذمہ دارانہ بات کرنا اور بلاتحقیق الزامات کو پھیلانا بھی ایک روحانی بیماری ہے۔ یہ بیماری اس آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کی حساسیت آخرت کی پکڑ کے بارہ میں مردہ ہو جائے۔

عبادت

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جن کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) یہ آیت حقیقتِ واقعہ کے اتنا زیادہ مطابق ہے کہ اگر صرف اسی ایک آیت پر غور کیا جائے تو وہ کسی آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہو گی کہ قرآن خداوند عالم کی کتاب ہے، انسان جیسی ایک مخلوق اس قسم کی کتاب وجود میں لانے پر قادر نہیں۔

انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں۔ ایک نفسیاتی (یا روحانی) اور دوسرے جسمانی۔ ان دونوں پہلوؤں سے انسان کی ترکیب ایسی ہے گویا وہ عبادتِ الٰہی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ عبادت کا سب سے زیادہ کامل مظہر نماز (صلاۃ) ہے۔ اس آیت کی روشنی میں نماز اور انسانی شخصیت کا مطالعہ کیجیے۔

انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان عین اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی کے آگے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس جھکاؤ سے انھیں خصوصی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ مگر غیر خدا کے آگے جھکنا اس جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اس طرح آدمی غیر خدا کو وہ چیز دیدیتا ہے جو اسے صرف خدا کو دینا چاہیے۔

نماز میں جب آدمی خدا کے آگے جھکتا ہے تو اس کو اپنے اس جذبہ کی پوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ نماز میں خدا کے آگے جھک کر وہ اپنے وجود کے اس پورے تقاضے کا جواب پالیتا ہے جو اس کے اندر اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ وہ اس کو نکالنا چاہے تب بھی وہ اس کو نکال نہ سکے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے فطری جذبہ کا مرجع حقیقی طور پر خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد انسان کے جسم کو لیجئے۔ آپ کسی آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک دیکھیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ نماز آدمی کے پورے جسم کا مکمل استعمال ہے۔ آپ کو ایسا معلوم ہو گا گویا آدمی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھے۔

نماز کے لیے آدمی کا اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہونا، قبلہ رخ متوجہ ہونا۔ پھر ہاتھ باندھنا۔ زبان سے نماز کے کلمات ادا کرنا اور امام کی آواز سن کر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جانا، دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر رکوع کرنا، ہاتھ اور پیشانی اور بقیہ پورے جسم کو استعمال کرتے ہوئے سجدہ میں جانا، پھر چہرہ کو دائیں اور بائیں

گھماکر سلام کرنا، دونوں ہاتھ اٹھاکر اللہ سے دعا کرنا۔ وغیرہ

یہ ساری چیزیں انسان کے جسم سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتی ہیں، اور ان حرکات میں انسان کے تمام اعضاء اس طرح شامل ہوجاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کا پورا جسم اسی لیے بنایا گیا تھا کہ وہ نماز کی شکل میں اپنے رب کی عبادت کرے۔

تمام انسان فطرت اللہ پر پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ فطرت اللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے اور نماز کی صورت میں اس کی عبادت کرے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذٰلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ منيبين اليه واتقوه واقيموا الصلاة ولا تكونوا من المشركين۔

پس تم یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف سیدھا رکھو۔ اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہوکر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

نماز کی یہی خاص صفت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے لوگوں نے صرف مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسلام قبول کرلیا۔

آدمی کے اندر جو فطرت ہے وہ عبادت کی فطرت ہے۔ آدمی کا پورا وجود عبادت کا طالب ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر نماز پڑھنے کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا پورا جسم اور اس کے تمام اعضاء نماز کی صورت میں ڈھل جانے کا خاموش داعیہ لیے ہوئے ہیں۔

اب جب ایک آدمی کسی نمازی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا پورا وجود کہہ اٹھتا ہے کہ یہی وہ عمل ہے جس کی طلب وہ اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ نماز اس کو خود اپنی تلاش کا جواب معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی فطرت کی یہ تڑپ اس کو مجبور کرتی ہے اور وہ نمازیوں کے ساتھ نماز میں جھک جاتا ہے۔ (اركعوا مع الراكعين)

اوصاف انسانی

قرآن میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو مقام پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالے جو اس کے جی میں ہے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم ۔ الرعد ۱۱)

اس خدائی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے ما بقوم (اجتماعی حالت) کا انحصار اس کے ما بانفس (انفرادی حالت) پر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حیثیت قومی کا دار و مدار اوصاف انسانی پر ہے۔ کسی قوم کے افراد میں انسانی یا اخلاقی اوصاف جیسے ہوں گے، اسی نسبت سے اس کو دنیا میں اجتماعی مقام حاصل ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے موجودہ زمانہ کی ایک مثال لیجئے۔ یہ بات سبھی لوگ مانتے ہیں کہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس ترقی کا ایک خاص راز ان کا اتحاد ہے۔ جاپانی ہر کام کو متحدہ انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے اتحاد کو آخر وقت تک برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

جاپان کے اس اتحاد کا راز ان کے افراد کا ایک شخصی مزاج ہے جو تقریباً تمام جاپانیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر چی نکانی (Chie Nakane) کی جاپانی زبان میں ایک کتاب ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں جاپانی سماج (*Japanese Society*) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں جاپانی پروفیسر نے لکھا ہے کہ جاپانیوں کا انفرادی مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں:

I am under someone (p. 51).

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر جاپانی احساس ماتحتی میں جیتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی اجتماعیت قائم ہوتی ہے تو وہ فوراً اس سے جڑ جاتا ہے، وہ تنظیم کے سربراہ کو فوراً اپنا سربراہ مان لیتا ہے، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے تھا کہ میں کسی کے ماتحت ہوں ——— یہ ہے جاپانیوں کے اس اتحاد کا راز جس کے نتیجہ میں انھوں نے موجودہ زمانہ میں حیران کن ترقی حاصل کی ہے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ مسلمانوں کا معاملہ جاپانیوں کے بالکل برعکس ہے۔ مسجد

سے لے کر سیاست تک کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں مسلمان متحد ہوں۔ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ بر باد قوم ہیں، اور اس کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کا عدم اتحاد ہے۔ اس بے اتحادی نے ایک ارب انسانوں کی عظیم قوم کو دنیا کی سب سے کمزور قوم بنا دیا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اس بے اتحادی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ ان کے افراد کا وہ غلط مزاج ہے جو کسی بھی اتحاد کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ بن گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جب مسلمان تنزل اور مغلوبیت کا شکار ہوئے تو ان کے رہنماؤں کی تشخیص یہ تھی کہ مغرب سے مرعوبیت نے ان کو زوال سے دوچار کیا ہے۔ چنانچہ تمام رہنماؤں نے ایک یا دوسری صورت میں یہ کیا کہ اسلام کو پر فخر انداز میں ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ ان کی مرعوبیت ختم کرسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پوری نسل فخر اور حاکمیت کے احساس پر پرورش پاکر اٹھی ہے۔ ہر آدمی نظری اور اعتقادی طور پر اپنے اندر برتری کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہی جذبہ اس کے اندر بھرا گیا تھا۔

یہ نفسیات اتحاد کی قاتل ہے۔ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ایک شخص کو بڑا بنا کر بقیہ تمام لوگ اس کے مقابلہ میں چھوٹے بننے پر راضی ہو جائیں۔ مگر مسلمانوں کی پر فخر نفسیات اس میں مانع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر آدمی سردار بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بات چلے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ حاکمانہ سیٹ پر بیٹھے۔ ایسی حالت میں اتحاد قائم ہونا ممکن نہیں۔ اور مسلمانوں کی یہی وہ نفسیات ہے جس نے آج ان کے درمیان کسی بھی اتحاد کو سراسر ناممکن بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اقتدار کو کھونا نہیں ہے بلکہ انسانی اوصاف کو کھونا ہے۔ موجودہ مسلمان، اپنے رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، اعلیٰ انسانی اوصاف سے خالی ہو گئے ہیں۔ اب سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا مسلمانوں کے احوال تبدیل نہیں ہو سکتے۔ کوئی دوسری کوشش خواہ وہ کتنی ہی بڑی مقدار میں کی جائے، مسلمانوں کے لیے کسی نئے بہتر مستقبل کی تخلیق نہیں کرسکتی۔

کاروانِ ملت

غالباً ۱۹۳۶ کی بات ہے جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) کے تحت ہندستان کا پہلا الکشن ہوا۔ ہر طرف انتخابی سرگرمیوں کی دھوم تھی۔ لوگ نہایت جوش و خروش میں تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) کا یہ شعر پہلی بار میرے کانوں نے سنا:

اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو　　　ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرِّقو کی

۱۹۳۶ سے پہلے اور اس کے بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ملت کے قافلے اٹھے۔ مسلم رہناؤں نے بے شمار تعداد میں طوفان خیز تحریکیں چلائیں۔ ان سرگرمیوں سے لوگوں نے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلیں جس کا ریکارڈ ماضی کے نظم و نثر کے ذخیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ طفیل احمد منگلوری نے "روشن مستقبل" کے نام سے ضخیم کتاب لکھی۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶ - ۱۸۷۱) نے اپنی ایک نظم میں یہ اعلان کیا:

عنقریب اسلام کی فصلِ بہار آنے کو ہے

ان سرگرمیوں پر نصف صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ اب ہمارے لکھنے اور بولنے والے دشمنانِ اسلام کی ان "سازشوں" کے انکشاف میں مشغول ہیں جنھوں نے ہماری پچھلی نسل کی طوفانی کوششوں کو بے نتیجہ کردیا۔ مگر یہ صرف خود فریبی ہے۔ کیوں کہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ اس دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ اپنی داخلی کمیوں کی بنا پر بازی ہارتی ہے نہ کہ بیرونی سازشوں کی بنا پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہناؤں نے اپنی قوم کو جو رہنمائی دی، وہ ایک لفظ میں یہ تھی کہ ــــ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر آگے بڑھو اور ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دو۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسلمان لفظی یا عملی تلوار بازی کے اسی مشغلہ میں مصروف رہے ہیں۔ آجکل پاکستان اور کشمیر میں یہی منظر دیکھا جا سکتا ہے جہاں مسلم نوجوان دہشت گردی کے عمل میں مشغول ہیں اور پرجوش طور پر یہ ترانہ گا رہے ہیں:

دل میں ہے اللہ کا نام　　　ہاتھ میں ہے کلاشنکوف (Kalashnikov)

اس رہنمائی میں بیک وقت دو غلطیاں تھیں۔ اس میں انتہائی معصومانہ طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن ہے اور ان کے دل میں اللہ کا خوف موجود ہے۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ صدیوں کے زوال کے نتیجہ میں قرآن سے مسلمانوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اور قساوت کے نتیجہ میں ان کے دل اللہ کے خوف سے خالی ہو چکے تھے۔

ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ لمبی اور خاموش جدوجہد کے ذریعہ جدید مسلم نسلوں کے دماغ میں دوبارہ قرآن کی روشنی پیدا کی جائے اور ان کے دلوں کو دوبارہ خدا کے خوف سے کانپنے والا بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد صبر آزما کام تھا۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس داخلی محاذ پر محنت کیے بغیر خارجی نعروں پر قوم کو دوڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کی ساری کوششوں کا انجام اس چھت کا سا ہوا جو دیمک زدہ لکڑی کے اوپر کھڑی کر دی گئی ہو۔

اس رہنمائی میں دوسری بھیانک غلطی یہ تھی کہ انھوں نے زمانہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ قدیم زمانہ میں "تلوار" طاقت کا نشان تھی، موجودہ زمانہ میں "علم" طاقت کا نشان ہے۔ مگر مسلم رہنما اندوہناک حد تک اس فرق سے بے خبر رہے۔ انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت سائنس کے دور میں ہر طرف تلوار کا ترانہ گانا شروع کر دیا۔

اس غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری نسل جنگ جویانہ ذہنیت میں مبتلا ہو گئی۔ ہر شخص بس جنگ اور ٹکراؤ کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ جس کے پاس تلواری جنگ چھیڑنے کا موقع تھا۔ اس نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف تلواری جنگ چھیڑ دی۔ اور جن لوگوں کے پاس صرف الفاظ تھے، انھوں نے الفاظ کی لامتناہی بم باری کا مشغلہ اپنے لیے اختیار کر لیا۔

اس انداز کار کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ اب مسلمانوں میں وہی آوازیں مقبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہیں جو جنگ جویانہ لہجے میں بولی گئی ہوں۔ تعمیر اور حقیقت پسندی کی بات مسلمانوں کو اپیل نہیں کرتی۔ جنگ جویانہ نعروں پر فی الفور ان کی بھیڑ جمع کی جاسکتی ہے مگر پرامن اور خاموش پروگرام کے نام پر انھیں بلائیے تو آپ کا پنڈال بالکل سونا پڑا رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا پورا ادب اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی نہج پر قائم ہو گئی ہیں۔ ان کی ہر تحریک میں کسی نہ کسی اعتبار سے یہی روح کارفرما ہے۔ آپ ان کے جس

فکری یا عملی رخ کا مطالعہ کیجیے، ہر جگہ آپ کو اسی کی جھنکار سنائی دے گی۔

نثر کے دور میں شاعری، خاموش تدبیر کے دور میں خطابت، عملی منصوبہ بندی کے دور میں لفظی ہنگامہ آرائی۔ تعمیر کے دور میں تخریب، پُرامن جدوجہد کے دور میں عسکری سرگرمی، سائنسی تفکیر کے دور میں روایتی تفکیر، حقائق کی بنیاد پر اٹھنے کے دور میں خوش خیالیوں کی بنیاد پر اٹھنے کا خواب ——— سب اسی کے مظاہر ہیں، اور یہی مختصر طور پر موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کی رہنمائی کا خلاصہ ہے۔ اس قسم کی ہر کوشش خلاف زمانہ حرکت (anachronism) کی مصداق تھی، اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

ملت کے کاروان کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے شاعری اور خطابت اور انشا پردازی کا انداز صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس قسم کی پرجوش لفاظی کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک پچھڑی ہوئی قوم دوبارہ خوش فہمیوں کے گڑھے میں گر کر رہ جائے۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ملت کے افراد میں دوبارہ سچی دینی روح پیدا کی جائے۔ ان کو "کلمہ گو" کی سطح سے اٹھا کر "کلمہ فہم" کی سطح پر لایا جائے۔ تقلیدی ایمان کی جگہ ان کے اندر زندہ اور شعوری ایمان پیدا کیا جائے۔ ان کے عقیدہ کو دوبارہ فکری انقلاب بنا دیا جائے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ملت کو عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر کیا جائے۔ ایک روایت میں مومن کو بصیراً بزمانہ (اپنے زمانہ سے باخبر انسان) بتایا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر ملت کا قافلہ اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

فخر کا نقصان

ایک مسلم رہنما نے اسلامی تعلیمات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا آغاز وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں ــــــ "دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کا نام یا تو کسی خاص شخص کے نام پر رکھا گیا ہے یا اس قوم کے نام پر جس میں وہ مذہب پیدا ہوا۔ مثلاً عیسائیت کا نام اس لیے عیسائیت ہے کہ اس کی نسبت حضرت عیسیٰ کی طرف ہے۔ بودھ مت کا نام اس لیے بودھ مت ہے کہ اس کے بانی مہاتما بدھ تھے۔ زردشتی مذہب کا نام اپنے بانی زردشت کے نام پر ہے۔ یہودی مذہب ایک خاص قبیلہ میں پیدا ہوا جس کا نام یہوداہ تھا۔ ایسا ہی حال دوسرے مذاہب کے ناموں کا بھی ہے۔ مگر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا قوم کی طرف منسوب نہیں ہے۔ بلکہ اس کا نام ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے جو لفظ اسلام کے معنی میں پائی جاتی ہے۔ یہ نام خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں ہے۔ نہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کو شخص یا ملک یا قوم سے کوئی علاقہ نہیں۔ صرف اسلام کی صفت لوگوں میں پیدا کرنا اس کا مقصد ہے۔"

مگر انھیں مسلم رہنما نے بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک اٹھائی تو اس کا نام انھوں نے "نظام مصطفیٰ" رکھا۔ یعنی محمدی نظام نہ کہ اسلامی نظام۔ جس مذہب کی شان انھوں نے یہ بیان کی تھی کہ اس کا نام کسی شخص کے نام پر نہیں ہے، اسی مذہب کو شخص کے نام پر منسوب کرکے اپنی پوری تحریک چلادی۔ یہ تضاد کیوں پیش آیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ انھوں نے کتاب میں جو کچھ لکھا، وہ اپنے فخر کا اظہار تھا۔ جو چیز فخر کے اظہار کے طور پر ہو وہ آدمی کی نفسیات کا جز نہیں بنتی اور اسی لیے وہ اس کے حقیقی عمل میں شامل نہیں ہوتی۔

فخر ہمیشہ دوسروں کے سامنے کیا جاتا ہے۔ کوئی آدمی کسی جزیرہ میں بالکل تنہا ہو تو وہاں فخریہ کلام اس کی زبان پر جاری نہیں ہوگا۔ جب وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تو وہ فخر کرے گا تو کس کے لیے کرے گا۔ وہ کس کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا دکھائے گا۔

بالفاظِ دیگر، فخریہ کلام دوسروں کے لیے نکلتا ہے نہ کہ خود اپنے لیے۔ اور جو کلام دوسروں کے لیے نکلے وہ اپنی اصلاح کا ذریعہ کیوں کر بن سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ظہور میں آنے والی تقریروں اور تحریروں کو کسی ایک خانہ میں رکھنا ہو تو وہ یقینی طور پر فخر کا خانہ ہوگا۔ "ہمارا نبی سب سے افضل، ہمارا دین سب سے کامل، ہماری تاریخ سب سے شاندار" یہی وہ نفسیات ہے جو موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والوں کے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے۔ شعراء نظم کے اسلوب میں اور مصنفین نثر کے اسلوب میں اسی کے نغمے گا رہے ہیں۔ اس نفسیات نے موجودہ زمانہ میں ہماری تمام کوششوں کو "اندر رخی" کے بجائے "باہر رخی" بنا دیا ہے۔

ہم اس لیے لکھتے اور بولتے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے فخر کا اظہار کریں، دوسروں کے درمیان اپنی بڑائی ثابت کر کے خوش ہوں۔ اس طرح ہمارا کلام اپنے آغاز ہی میں دوسروں کے لیے ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے اپنے لیے نہیں رہتا۔ جس کلام کا مقصد پُرفخر جذبات کی تسکین ہو اس کا نشانہ بالکل فطری طور پر دوسرے ہو جاتے ہیں۔ آدمی کی اپنی ذات اس کی زد میں نہیں آتی۔ آدمی اپنی برتری کے جذبات کی تسکین حاصل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ جو مطلوب تھا وہ اس کو مل گیا۔ اس کے بعد خود اپنی ذات کو اس کی میزان پر کھڑا کرنے کا خیال اسے کبھی نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اس کا مقصود ہی نہ تھا۔

مضحکہ خیز

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ۱۹۴۲ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے شعبہ میں لوکاسین پروفیسر ہیں۔ یہ وہ علمی منصب ہے جو اس سے پہلے نیوٹن اور ڈیراک جیسے اعلیٰ سائنس دانوں کو حاصل رہا ہے۔ وہ آئن سٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز نظریاتی طبیعیات داں (theoretical physics) سمجھے جاتے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ کی ایک کتاب نیویارک سے ۱۹۸۸ میں چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے —— وقت کی مختصر تاریخ :

A Brief History of Times

یہ ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ایک سال میں اس کے چودہ اڈیشن چھاپے گئے۔ اس کتاب کا آغاز حسب ذیل سطروں سے ہوتا ہے :

" ایک مشہور سائنس داں نے ایک بار فلکیات کے موضوع پر ایک عوامی لکچر دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ برٹرینڈ رسل تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور کس طرح سورج ہماری کہکشاں کے مرکز میں گھومتا ہے جو کثیر ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے خاتمہ پر ایک چھوٹی بوڑھی عورت

A well-known scientist (some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from, and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened *before* then? What is the nature of time! Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun – or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

کمرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا: تم نے جو کچھ ہمیں بتایا وہ بالکل لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا پلیٹ کی مانند چپٹی ہے جو ایک بہت بڑے کچھوے کی پیٹھ پر ٹکی ہوئی ہے۔ سائنس داں جواب دینے سے پہلے فاتحانہ انداز سے مسکرایا اور پھر خاتون سے پوچھا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر کھڑا ہے۔ بوڑھی عورت بولی: اے نوجوان، تم بہت چالاک ہو، مگر یہ کچھوے پر کچھوا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ ہماری دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ کچھوؤں کا ایک لامتناہی کھمبا ہے جس کے اوپر یہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ مگر کیوں ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے۔ ہم کائنات کے بارہ میں کیا جانتے ہیں اور ہم کس طرح اس کو جانتے ہیں۔ کائنات کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا کائنات کا ایک آغاز ہے اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے جو گزرا وہ کیا تھا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہوگا۔ فزکس کے حالیہ انکشافات نے جزئی طور پر نئی حیرت ناک ٹکنالوجی کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس سے کچھ قدیم سوالوں کے جواب معلوم کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ کچھ دن تک یہ جوابات ہم کو اسی طرح واضح دکھائی دے سکتے ہیں جیسے کہ سورج کے گرد زمین کا گھومنا۔ یا شاید وہ آئندہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگیں جیسا کہ کچھوؤں کا کھمبا۔ صرف وقت، خواہ وہ جو بھی ہو، اس کے بارہ میں بتا سکے گا۔" صفحہ ۱-۲

جدید نظریات کے مضحکہ خیز ثابت ہونے کے لئے ہمیں مستقبل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل دانش کے لئے ان کا مضحکہ خیز ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ مثلاً جدید سائنسی فکر کے مطابق دنیا کے واقعات اسباب وعلل کی ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب ہے، اور پھر اس سبب کے پیچھے ایک اور سبب۔ اس طرح یہ سلسلہ برابر چلا جا رہا ہے۔ اس قسم کا لامتناہی سلسلۂ اسباب بلاشبہہ اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا کہ کچھوؤں کی لامتناہی قطار۔

زندگی اور کائنات کی حقیقت کے بارہ میں آج کا انسان عجیب عجیب غلط فہمیوں میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک بے مقصد ہنگامہ ہے۔ وہ اپنے آپ شروع ہوا اور اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کسی کا خیال ہے کہ بہت سی روحیں یا دیوتا ہیں جو اس دنیا کے مالک ہیں۔ کوئی اسباب وعلل یا قانون اتفاق (law of chance) کے تحت اس کی تشریح کر رہا ہے، وغیرہ

یہ تمام باتیں بلاشبہ لغو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے جو تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اسی نے انسان کو اور کائنات کو پیدا کیا۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ یہ دنیا کوئی الل ٹپ یا بے مقصد دنیا نہیں۔ یہ خدا کے منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس کا آغاز اور اس کا انجام دونوں منصوبۂ خداوندی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مذہب اور جدید چیلنج)

انسان کے بارہ میں خدا کا منصوبہ یہ ہے کہ اس نے انھیں پیدا کر کے امتحان کے لئے موجودہ دنیا میں رکھا ہے۔ اس کا یہ امتحان پیدائش سے موت تک جاری رہتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی کے جزا کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اپنے دنیوی عمل کے مطابق، یا تو جنت کی پر راحت زندگی پائے گا یا جہنم کے عذاب خانہ میں داخل کر دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ بربنائے امتحان ہے، آخرت میں جو کچھ اس کو دیا جائے گا وہ بربنائے استحقاق ہوگا۔ یہ فرق پورے معاملہ کو آخری حد تک بدل دے گا۔ موجودہ دنیا میں ہر چیز ہر آدمی کو ملی ہوئی ہے۔ کیوں کہ امتحان کے لئے اس کو سب کچھ دینا ضروری تھا۔ اگر چیزیں اور مواقع نہ دئے جائیں تو آدمی کا امتحان کیسے ہوگا۔ مگر موت کے بعد آنے والی دنیا میں صورت حال یکسر بدل جائے گی۔

جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنا استحقاق ثابت نہ کر سکے، وہ آخرت کے عالم میں اس طرح داخل ہوگا کہ وہاں وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو بے بسی کے عالم میں پائے گا۔ موجودہ دنیا میں اس کو ہر چیز اپنی نظر آتی ہے۔ آخرت میں ہر چیز اس کے لئے غیر ہو جائے گی۔ وہ ایسے ماحول میں ہوگا جہاں اجنبیت اور بے چارگی کے سوا کوئی اس کا استقبال کرنے والا نہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے، اگر تم سچے ہو۔ کاش یہ انکار کرنے والے اس وقت کو جانتے جب وہ آگ کو اپنے سامنے سے نہ روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے۔ اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آجائے گی، پس وہ حیران رہ جائیں گے، پھر وہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی (الانبیاء ۳۸ - ۴۰)

ایک سوال

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ "بے سبب" خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو "بے سبب" میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہئے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق لازمی قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

تعلیم — قومی ترقی کی بنیاد

قومی ترقی (نیشنل ڈولپ منٹ) کا مسئلہ، بنیادی طور پر فرد کی ترقی (انڈویجول ڈولپ منٹ) کا مسئلہ ہے۔ جس طرح کسی مشین کی درست کارکردگی کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے پرزے درست ہوں، اسی طرح کسی سوسائٹی کے بہتر سوسائٹی ہونے کا دارو مدار اس پر ہے کہ اس کے افراد صحیح افراد ہوں۔

قومی تعمیر کا کام دراصل فرد کی تعمیر سے شروع ہوتا ہے۔ اور فرد کی تعمیر کا کام یہ ہے کہ فرد کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ پڑھا لکھا آدمی باتوں کی گہرائی کو سمجھتا ہے۔ مزید یہ کہ پڑھے لکھے آدمی ہی کو گہری باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔ جاہل آدمی صرف سطحی نعروں کو جانتا ہے۔ اور جس قوم کے افراد صرف سطحی نعروں کو جانیں، باتوں کی اصلیت کو نہ جانیں، ان کو کسی بھی طرح بربادی سے بچایا نہیں جا سکتا۔

اس اعتبار سے قوم کی ترقی کے لئے ہمیں جو کام سب سے پہلے کرنا تھا یا آج جس کام کو سب سے زیادہ کرنا ہے، وہ تعلیم ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے یہاں پر شور تحریکوں کے باوجود سب سے زیادہ اسی اہم ترین پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے رہنماؤں نے سوچا کہ ملک کو اگر خود اپنی سیاسی بنیاد (پولٹیکل بیس) حاصل ہو جائے تو اس کے بعد ملک تیزی سے ترقی کرنے لگے گا۔ ۱۹۴۷ کی آزادی نے ملک کو یہ سیاسی بنیاد دے دی۔ مگر قومی ترقی کا خواب اس کے باوجود پورا نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ کے بعد جن رہنماؤں کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آیا، ان کی سوچ زیادہ تر یہ تھی کہ ملک کو صنعتی بنیاد (انڈسٹریل بیس) حاصل ہو جائے تو وہ ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔ چنانچہ سب سے زیادہ زور اسی پہلو پر دیا گیا۔ مگر قومی دولت کا سب سے زیادہ حصہ صنعتی ادارے قائم کرنے پر خرچ کرنے کے باوجود آج بھی ملک اس منزل سے محروم ہے جس کو قومی ترقی کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پولٹیکل بیس یا انڈسٹریل بیس کا درجہ قومی ترقی میں نمبر ۲ پر ہے۔ نمبر ایک درجہ پر جو چیز درکار ہے وہ انٹلکچول بیس ہے اور وہ ابھی صحیح معنوں میں ملک کو حاصل نہیں ہوئی۔

اس کے مقابلہ میں آپ جاپان کو دیکھئے۔ جاپان نے اپنا موجودہ سفر تقریباً اسی وقت شروع

کیا جب کہ ہندستان نے آزادی کے بعد اپنا سفر شروع کیا۔ آج جاپان عالمی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں ٹاپ پر شمار ہوتا ہے جب کہ ہندستان عالمی ترقی کے نقشہ میں کہیں موجود نہیں۔

اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ جاپان نے اول دن تعلیم کی اہمیت کو سمجھا۔ چنانچہ جاپان میں نہ صرف لازمی تعلیم رائج کی گئی۔ بلکہ وہاں اسکول کے معیار کو اتنا اونچا کیا گیا کہ اسکول کے ماسٹروں کے لئے منسٹروں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ ان کو سماج میں سب سے معزز درجہ دیا گیا۔ اور اس فیصلہ پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ عمل شروع کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی جدید نسل پوری کی پوری ایسے تعلیمی اداروں میں پہنچ گئی جہاں ان کو پڑھانے کے لئے ملک کے بہترین قابلیت والے لوگ موجود تھے۔ اس کا فائدہ انھیں یہ ملا کہ صرف ربع صدی میں جاپان میں ایک نئی تعلیم یافتہ نسل تیار ہو گئی۔

یہ تعلیم جاپان کی ترقی کے لئے انتہائی ضروری تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان کو ایک نیا انقلابی فیصلہ لینا تھا۔ وہ فیصلہ جس کو جاپانیوں نے معکوس راستہ (reverse course) کا نام دیا ہے۔ جاپان، دوسری عالمی جنگ سے پہلے، جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ پر چل رہا تھا۔ جنگ کے بعد نئی ترقی کے امکان کو حاصل کرنے کے لئے اس کو امن اور مفاہمت کے راستہ پر چلنا تھا۔ یہ گویا پہیہ کے رخ کو الٹی طرف گھمانا تھا۔ یہ بلاشبہ انتہائی مشکل فیصلہ تھا اور صرف اعلیٰ درجہ کے باشعور دماغ ہی ایسا انقلابی فیصلہ لے سکتے تھے۔ جاپان کے لئے تعلیم پر زور دینے کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وہ اتنا انقلابی فیصلہ لے سکے اور مختصر مدت میں اس کا پھل پا سکے۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان کے لوگ وحشی سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ بہترین مہذب لوگ ہیں۔ اس سے پہلے وہ سب سے زیادہ جنگ جو قوم تھے، آج سب سے زیادہ امن پسند قوم ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کی ہاری ہوئی اور برباد قوم نے چالیس سال کے مختصر عرصہ میں صنعتی دیو (industrial giant) کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ سب کارنامہ ہے اس بات کا کہ انھوں نے اپنے افراد کو تعلیم یافتہ افراد بنانے پر سارا زور صرف کیا۔

میرے نزدیک ہندستان کی ترقی کا راز صرف ایک ہے۔ اور اس وقت تک ترقی رکی رہے گی جب تک یہ شرط پوری نہ کی جائے۔ اور وہ ہے افراد کو تعلیم یافتہ بنانا۔ اب ہمارا سب سے پہلا نشانہ

صرف ایک ہونا چاہئے ۔ یعنی لازمی تعلیم اور صد فی صد تعلیم ۔ اس سے کم کی کوئی بھی چیز ہمیں ترقی یافتہ قوم نہیں بنا سکتی ۔

ہندستان کی ٥٠ فی صد آبادی ابھی تک تقریباً جاہل ہے ۔ ایسی حالت میں ہندستان جیسے بڑے ملک کے لئے " لازمی تعلیم اور صد فی صد تعلیم " کا منصوبہ کوئی سادہ سی بات نہیں ۔ یہ بلاشبہ انتہائی مشکل کام ہے ۔ اس پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے ہمیں اپنی سوچ میں انقلابی تبدیلی لانی پڑے گی ۔ مثلاً ملکی دفاع کے موجودہ بجٹ میں قابل لحاظ حد تک کمی کرنا ، وغیرہ ۔ ہمیں خطرات کو نظر انداز کرکے اس کام کی طرف آگے بڑھنا ہوگا ۔ اس کے بغیر قوم کو تعلیم یافتہ بنانا ہرگز ممکن نہیں ۔

یہاں میں دوبارہ کہوں گا کہ اگر ہم ایسا حوصلہ کریں تو ہم اس میدان میں اکیلے نہیں ہوں گے ۔ مثلاً جاپان نے جو معجزاتی ترقی کی ہے ، اس کی ایک زبردست قیمت اس کو ادا کرنی پڑی ۔ اس کو وہ کام کرنا پڑا جس کو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے " ناقابل برداشت کو برداشت کرنا " بتایا تھا ۔

یہ ناقابل برداشت چیز امریکہ کے سیاسی اور فوجی غلبہ کا مسئلہ تھا ۔ جاپان اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد اس مسئلہ کو چھیڑتا تو وہ تعلیم و ترقی کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا ۔ چنانچہ اس نے اس اصول پر عمل کیا کہ —— مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو :

Starve the problems, feed the opportunities.

جاپان نے امریکی غلبہ کے مسئلہ کو نظر انداز کیا ، اور جو میدان اب بھی اس کے لئے کھلا تھا ، یعنی اپنی نسل کو تعلیم یافتہ بنانا ، اس پر اپنی ساری توجہ لگادی ۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال میں پوری تاریخ بدل گئی ۔

آخر میں یہاں میں پیغمبر اسلام کا ایک واقعہ نقل کرنا چاہتا ہوں جو اس معاملہ میں ہمارے لئے بہت حوصلہ افزا مثال پیش کرتا ہے ۔

پیغمبر اسلام کو اپنے مخالفین کے ساتھ چند دفاعی جنگیں لڑنی پڑیں ۔ ان میں سے ایک جنگ وہ ہے جو جنگ بدر کہی جاتی ہے ۔ اس جنگ کے بعد آپ کے پاس دشمن کے ۷۰ افراد جنگی قیدی کے طور پر آئے ۔ یہ لوگ مکہ کے تھے ۔ آپ نے ان قیدیوں کا یہ فدیہ مقرر کیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص اگر مسلمانوں کے دس نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اس کو رہا کر دیا جائے گا ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا اسکول تھا جو خود پیغمبر نے قائم کیا۔ اس اسکول کے تمام ٹیچر نہ صرف غیر مسلم بلکہ اسلام کے ثابت شدہ دشمن تھے۔ مزید یہ کہ ان لوگوں کو رہا کرنے میں یہ یقینی خطرہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ منظم ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت کریں گے۔ مگر ان تمام ناموافق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ نے ان کے ذریعہ سے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔

علم اور تعلیم کو یہ غیر معمولی اہمیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور اول کے مسلمانوں میں یہ روایت قائم ہو گئی کہ علم سب سے بڑی چیز ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو جب مواقع ملے تو انھوں نے سب سے زیادہ علم کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے اپنی ہر مسجد اور ہر گھر کو مدرسہ بنا دیا۔ انھوں نے بے شمار تعداد میں یونیورسٹیاں اور کتب خانے قائم کئے۔ تمام دنیا کی کتابیں (بشمول ہندستان) جمع کر کے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی۔ توہماتی دور کی جگہ ایک نیا سائنٹفک دور پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ واقعہ ظہور میں آیا جس کو ایک امریکی انسائکلو پیڈیا میں "اسلام" کے مقالہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

علم ہی تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، خواہ مذہبی ترقی کا معاملہ ہو یا سیکولر ترقی کا معاملہ۔ اس لئے جو لوگ بھی حقیقی ترقی چاہتے ہوں، انھیں چاہئے کہ سب سے زیادہ تعلیم اور مطالعہ پر زور دیں۔ تعلیم اور مطالعہ افراد کو باشعور بناتا ہے، اور باشعور افراد ہی کسی گہری بات کو سمجھتے ہیں، باشعور افراد ہی اس دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ اس "تعمیری لاوا" کو پکانے کے لئے الرسالہ کا مسلسل جاری رہنا ضروری ہے، پھر آپ نے اپنے بعد اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مشن آج بھی اللہ کی مدد سے جاری ہے، اور آئندہ بھی اللہ نے چاہا تو اسی کی مدد سے وہ جاری رہے گا۔ تاہم اسباب کے درجہ میں میں کہہ سکتا ہوں کہ جس قسم کے افراد دوسری تحریکوں کے پاس ہیں اور ان تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اس قسم کے افراد ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ پھر جس درجہ کے افراد دوسری تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اسی درجہ کے افراد اس تحریک کو کیوں جاری نہیں رکھ سکتے۔

اس کانفرنس میں میں نے کوئی مقالہ پیش نہیں کیا۔ یہ کانفرنس مقالات کے لئے نہیں تھی۔ اس میں کسی کا بھی کوئی مقالہ پیش نہیں ہوا۔ اس کانفرنس کا خاص موضوع دو چیزوں پر غور کرنا تھا۔ ایک مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کا اتحاد۔ دوسرے، عالم اسلام کو پیش آنے والے خطرات ومسائل۔

لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق مختلف باتیں کہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ مسلم دنیا کا اتحاد محض ایک کانفرنس کر کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مستقل اور متواتر کوشش کرنا ہوگا۔ اس کوشش کا خاص نکتہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو جائیں۔ اس دنیا میں کبھی اتحاد کی بنیاد پر اتحاد نہیں ہوتا بلکہ اختلاف کی بنیاد پر اتحاد ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔ اس لئے وہ جگہ جگہ لڑ رہے ہیں۔ وہ اعراض کرنے والی باتوں میں ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر جس دن "اختلاف کے باوجود اتحاد" کا مزاج آجائے گا اسی دن ان کے درمیان عملاً اتحاد قائم ہو چکا ہوگا۔

خطرات ومسائل کے بارے میں میں نے کہا کہ خطرات ومسائل اگرچہ بظاہر ہمارے باہر نظر آتے ہیں۔ مگر خطرات ومسائل کے اسباب ہمارے اپنے اندر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بے شعوری، ان کے اندر مقابلہ کی استعداد کی کمی، زمانی قوت میں ان کا پیچھے ہو جانا، یہ اصل اسباب ہیں جنھوں نے موجودہ مسلمانوں کو ہر جگہ خطرات ومسائل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس بظاہر بیرونی مسئلہ کے لئے بھی ہمیں سب سے زیادہ اپنے داخلی محاذ پر محنت کرنا چاہئے۔

ہوٹل کے طعام گاہ میں ایک میز پر ہم تین آدمی دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے سوا ایک شارجہ

کے تھے اور دوسرے مصر کے۔ کچھ دیر بعد ایک اور مصری ڈکتور آئے۔ وہ ہمارے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ایک منٹ انتظار کے بعد ہوٹل کے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا: هل المتأخرون يأكلون ام لا (کیا بعد کو آنے والے کھائیں گے یا نہیں) تھوڑی ہی دیر میں آدمی نے کھانے کی پلیٹ لاکر ان کے سامنے رکھ دی۔ حالانکہ عام حالت میں انھیں دیر میں کھانا پہنچنا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح اکثر حالات میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ وہ کھانے کے پورے وقت میں مزاحیہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔

اکثر لوگوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے ذاتی طور پر یہ انداز بالکل پسند نہیں۔ جس وقت کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، وہ انتہائی سنجیدگی کا وقت ہوتا ہے۔ کھانا اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی پر سب سے زیادہ شکر کا جذبہ طاری ہونا چاہئے۔ ایسے موقع پر مزاحیہ کلام شکر کے احساسات کا قاتل ہے۔ دسترخوان کے اوپر سب سے بڑا کلام یہ ہے کہ آدمی خاموش رہے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے کھانا کھائے۔

ایک مشہور عرب شخصیت کے بارہ میں ایک صاحب نے بتایا کہ وہ آپ کی الاسلام یتحدی جیسی کتابوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا کہنا ہے کہ وحید الدین خاں آخرت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، مگر قرآن میں آخرت کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں پائی جاتی (الشیخ وحید الدین یرکز علی الآخرة ، و الآخرة لیس لها اهمیة فی القرآن)

میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں یہ ایک ایسے شخص کا تاثر ہے جو مسلمان ہے۔ دوسری طرف ہندستان میں ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص کو قرآن کا ہندی ترجمہ دیا گیا۔ اس نے پڑھنے کے بعد اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ قرآن کو پڑھ کر تو میں بہت ڈر گیا۔ کیوں کہ اس میں تو سب آخرت اور حساب وکتاب کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ مسلم ملکوں میں ہر جگہ جبر ہے۔ مگر اس جبر کو ختم کرنے کے لئے کوئی طاقت ور تحریک نہیں اٹھتی۔ میں نے کہا کہ یہ تفکیر پیغمبرانہ تفکیر کے مطابق نہیں۔ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جبر (سیاست میں بگاڑ) کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش شرک (عقیدہ میں بگاڑ) کو درست کرنے پر لگا دیتا ہے۔ جبر کو ختم کرنے کا کام خود خدا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ البتہ شرک

کو ختم کرنے کی ذمہ داری داعی کے اوپر ڈالی گئی ہے۔

جبر کو قانون خداوندی کے تحت بہر حال ختم ہونا ہے۔ اس لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ عقیدہ کی اصلاح، ذہن کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر پر محنت صرف کی جائے۔ تاکہ جب خدا جابروں کے اقتدار کو توڑے تو صالح افراد کا ایک قابل اعتماد گروہ اس کی جگہ لینے کے لئے معاشرہ میں موجود ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی جبر کے نظام کو توڑنے کو اولین اہمیت دے دی۔ وہ اپنی ساری توجہ اور محنت اسی محاذ پر صرف کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک سیاسی جبر ٹوٹا تو اس کی جگہ دوسرے سیاسی جبر نے لے لی، کیونکہ اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی قابل اعتماد صالح گروہ وہاں موجود نہ تھا۔

مثلاً مصر کے اسلام پسندوں نے شاہ فاروق کے سیاسی جبر (۱۹۵۲) کو توڑا تو اس کے فوراً بعد جمال عبدالناصر کا سیاسی جبر قائم ہو گیا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے ایوب خاں کے سیاسی جبر (۱۹۶۹) کو توڑا تو اس کے بعد جو چیز وہاں قائم ہوئی وہ مسٹر بھٹو کا سیاسی جبر تھا۔

ایک صاحب نے جنرل محمد ضیاء الحق کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں جنرل ضیاء الحق صاحب کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقوام متحدہ کے ایوان میں حق کی آواز بلند کی۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے ساڑھے گیارہ سالہ دورِ حکومت (۸۸-۱۹۷۷) کے دوران میرے نزدیک اسلام یا ملت اسلام کا کوئی حقیقی کام نہیں کیا۔ جو کام ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں (مثلاً اقوام متحدہ میں تقریر کرنا) وہ سب اخباری اہمیت کے کام ہیں نہ کہ حقیقی اہمیت کے کام۔ البتہ صدر ضیاء الحق کے ذریعہ ایک کارنامہ ضرور انجام پایا ہے۔ اور وہ ہے ایک افسانہ کا خاتمہ۔ ان کے ذریعہ پاکستان کا اسلام پسند طبقہ مکمل طور پر اکسپوز (expose) ہو گیا۔ ضیاء الحق صاحب نے حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر وہاں کی اسلام پسند جماعت اور وہاں کے علماء کو مکمل مواقع دئے۔ مگر ان لوگوں نے صرف یہ ثابت کیا کہ وہ لوگ اس کام کے لئے آخری حد تک نااہل ہیں۔ وہ نہ حکومتی عہدوں کو اسلامی انداز پر سنبھالنے کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ حکومت کے باہر کوئی گہرا تعمیری کام کرنے کی صلاحیت ان کے اندر موجود ہے۔

موجودہ حالت میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خاموش فکری مہم کے ذریعہ ذہنوں کو بدلا

جائے ۔ اس کو "تعمیر شعور" کی مہم کہا جا سکتا ہے ۔ یہ کام اگر صحیح انداز میں کیا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد ایک طرف اعلیٰ صلاحیت کے افراد کی ایک باشعور ٹیم تیار ہو جائے گی جو ذمہ دارانہ مناصب کو چلانے کی اہل ہو ۔ دوسری طرف عمومی سطح پر معاشرہ میں صالح تعمیری فضا پیدا ہو جائے گی ۔ یہی دونوں وہ چیزیں ہیں جو ایک جابرانہ نظام کے ٹوٹنے کے بعد دوسرے صالح نظام کے قیام کی ضمانت بن سکتی ہیں ۔ یہی وہ "صبر" ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے : وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا ۔

یہاں جس نشست یا جس مجلس میں بھی مجھ کو بولنے کا موقع ملا ، میں نے دعوت کی بات کہی ۔ ایک نشست میں میں نے کہا کہ اللہ کی سب سے بڑی مرضی ، قرآن و حدیث کے مطابق ، یہ ہے کہ اس کے بندے آگ میں جانے سے بچیں ۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کے دین کا پیغام ہر ملک میں اور ہر گھر میں پہنچ جائے ۔ اس کام کی تکمیل دور آخر میں ہونے والی ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر ولا وبر الا ادخله الله كلمة الاسلام ۔ حدیث کے راوی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس وقت دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے گا (قلت فيكون الدين كله لله)

اس کے ساتھ اس واقعہ کو ملا لیجئے کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار وہ وسائل اعلام انسان کے قبضہ میں آئے ہیں جو اس قسم کی عالمی اشاعتِ دین کو ممکن بنا دیں ۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مرضی یہ ہے کہ اللہ کے سچے دین کی آواز تمام دنیا اور ہر گھر میں پہنچانے کی کوشش کی جائے ۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ مسلمانوں کو ہر دوسرا کام چھوڑ کر اس کو انجام دینا ہوگا ۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کام کو موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا ۔ مثال کے طور پر اگر ہم اسلام کی مخاطب قوموں سے غیر دعوتی عنوانات پر ٹکراؤ کرتے رہیں تو وہ فضا درہم برہم ہو جائے گی جب کہ کسی شخص تک دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنے اور اس پر غور کرے ۔

ایک اور نشست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم جماعتیں مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہی ہیں ، اس کو میں سراسر لغو سمجھتا ہوں ۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلام

کا مقصد صالح نظام بنانا ہے۔ اور صالح نظام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ زمانہ کی مسلم حکومتیں ہیں جو سیاسی جبر کے اوپر قائم ہیں۔ اگر ہم اس سیاسی جبر کا خاتمہ نہ کریں تو ہم کبھی بھی صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے کہا کہ جبر (اجباری نظام) کو توڑنے کے لئے ہمیں براہ راست جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام خود خدا کی طرف سے زیادہ مؤثر طور پر انجام دیا جا رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ لوگوں کو اپنے عمل کی آزادی ہو۔ اگر کسی آدمی کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا جائے تو اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں جا کر نماز ادا نہیں کی۔

رات کا اندھیرا ضرور ختم ہوتا ہے۔ رات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اس سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یہ استعداد پیدا کریں کہ جب رات ختم ہو کر دن آئے تو ہم اس کو پوری طرح استعمال کر سکیں۔ اسی طرح نظام جبر کے دوران ہمیں یہ تیاری کرنا چاہئے کہ جب خدا اس کو ختم کرے تو ہم نئے مواقع کو استعمال کر کے صالح نظام کی تعمیر کر سکیں۔

۹۰ - ۱۹۸۹ کے درمیان روس میں جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کے اسی قانون کی بنا پر ہے۔ سوویت یونین نے زمین کے ایک بڑے رقبہ پر کامل جبر کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ صورت حال خدا کی مصلحت کے سراسر خلاف تھی۔ یہ خدا کی دی ہوئی امتحانی آزادی کو ساقط کرنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ خدا کی طاقت ظاہر ہوئی اور اس نے حیرت انگیز طور پر سوویت امپائر کو توڑ دیا۔

موجودہ زمانہ کے اسلام پسند رہنما اپنے حصہ کا کام نہیں کرتے۔ وہ خدا کے حصہ کا کام کرنے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خدا نظام جبر کو توڑتا ہے تو اسلام پسند قائدین اس حیثیت میں نہیں ہوتے کہ وہ سابق نظام کی جگہ لے سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جبر کے بعد دوسرا جبر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یا نظام جبر ٹوٹنے کا فائدہ صرف ان لوگوں کے حصہ میں چلا جاتا ہے جو آزادی کو بے راہ روی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

کھانے کی میز پر دو آدمی بات کر رہے تھے۔ ایک قبرص کے تھے۔ دوسرے سرینام کے۔ دونوں میں تعارف ہوا۔ گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب اپنے ملک کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ دوسرے

صاحب ایک تنظیم کے سکریٹری تھے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ معلومات اپنے ملک کے بارہ میں بھیجنے کے لئے کہا۔ دوسرے نے کہا کہ ضرور بھیجوں گا۔ آپ اپنا فیکس (FAX) نمبر دیدیجئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید وسائل کے ظہور نے موجودہ زمانہ میں مواصلات کو کتنا تیز رفتار بنا دیا ہے۔ ڈاک اور تار اور ٹیلکس اب "فرسودہ" چیز بن چکے ہیں۔ اب آدمی "فیکس" کی رفتار سے مواصلاتی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے اسلامی ادارے ابھی اس سے بہت دور ہیں کہ ان کے یہاں فیکس کا طریقہ استعمال ہونے لگے۔ اگر کسی ادارہ میں کسی "شیخ" کی فیاضی سے فیکس کی مشین لگ گئی ہو، تب بھی وہ عملاً بے فائدہ ہے۔ مواصلاتی ذرائع کا مشینی ارتقا، جس بلندی تک پہنچا ہے، اسلامی اداروں کا شعوری ارتقا ابھی جب تک اس بلندی تک نہ پہنچے، اس وقت تک فیکس جیسی چیزوں کا صحیح استعمال ان اداروں میں ممکن نہیں۔

عربوں کی ایک مجلس میں میں نے اسلام کے روحی پہلو پر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال اس آیت جیسا ہو رہا ہے کہ یعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون (الروم ۷) وہ عظمت ظاہری کو جانتے ہیں مگر وہ عظمت معنوی کو نہیں جانتے۔ دین کا معنوی پہلو ہی اس کا اصل پہلو ہے۔ مگر اپنی اس کمی کی بنا پر وہ اس کے ادراک سے عاجز ہو رہے ہیں اور ظاہری پہلوؤں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے۔ مجھے یورپ کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ کھانوں سے بھری ہوئی میز کے سامنے بے فکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ چھری کانٹے کی دھیمی موسیقی میں لوگوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر آدمی تفریحی باتیں کر کے اپنی بے فکری کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک عرب ساتھی سے کہا کہ لوگوں کو جنت کیسے مل سکتی ہے جب کہ ان کا یہ حال ہو کہ اس کے لئے عمل کرنا تو درکنار، انھوں نے خدا سے اس کو مانگا بھی نہیں۔

(كيف تكون لهم الجنة وهم لم يسألوا الله الجنة فضلاً عن ان يعملوا لها)

میں نے کہا کہ جنت کا مستحق بننے کے لئے کم سے کم جو چیز درکار ہے، وہ یہ کہ آدمی کے دل میں اس کی شدید طلب پیدا ہو۔ ایک طرف اپنی بے مائگی کا احساس اور دوسری طرف جنت کا اشتیاق،

اس دو طرفہ احساس کے نتیجہ میں اس کی زبان سے بے اختیارانہ نکل پڑے کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جو مجھ کو جنت میں لے جائے۔ لیکن خدایا، میں عاجز ہوں۔ جہنم کو برداشت کرنے کی طاقت میرے اندر نہیں۔ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں۔ تو مجھے جنت دیدے، اس لئے نہیں کہ میں نے اس کے لئے عمل کیا، بلکہ اس لئے کہ میں نے تجھ سے اسے مانگا:

یارب لیس عندی عمل یوذی بی الی الجنة، ولکن انا عاجز لا استطیع الصبر علی النار۔ فانا اسألك الجنة۔ رب هب لی الجنة، لا لأنی عملتُ لها بل لانی سألتُها منك۔

اکثر بالواسطہ نتیجہ زیادہ بڑا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اپنی ظاہر پسندی کی وجہ سے صرف براہ راست واقعات کو دیکھ پاتے ہیں۔ اور اسی کی بابت بحث ومباحثہ میں الجھے رہتے ہیں۔ مثلاً جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور قوم پرستی کے نظریات مسلم پریس میں زیادہ تنقید کا موضوع رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ دوررس نتائج وہ ہیں جو جمال عبدالناصر کی لایعنی پالیسیوں کے ذریعہ بالواسطہ طور پر برآمد ہوئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں پڑھیں ہیں اس کے بعد گفتگو کے دوران جمال عبدالناصر کا ذکر آیا تو وہ جمال عبدالناصر کی پالیسیوں پر سخت تنقید کرنے لگے۔

میں نے کہا کہ مجھے جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور ان کے قوم پرستی کے نظریات سے اتفاق نہیں۔ تاہم یہ جمال عبدالناصر ہی کی "برکت" ہے کہ ان شخصیتوں کو عرب دنیا میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جن کا آپ نے ذکر کیا۔ یہ گویا ناصرازم کا بالواسطہ نتیجہ تھا۔

جمال عبدالناصر نے سوشلزم کا نعرہ لگایا اور روس سے اپنا رشتہ جوڑا۔ وہ عالم عرب کا لیڈر بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ اپنے اس جوش کے تحت انھوں نے یہ حماقت کی کہ انھوں نے کمیونسٹ یمن کی تائید کی اور یمن کے راستہ سے اپنی فوجیں سعودی عرب میں داخل کر دیں۔

ناصر کی ان پالیسیوں کے نتیجہ میں ناصر اور سعودی حکمرانوں کے درمیان شدید رقابت قائم ہوگئی۔ مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ چونکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی فکری حیثیت سے اور

سید قطب سیاسی رقیب کی حیثیت سے ناصر کے مخالفین میں تھے ، اس لئے ان دونوں (اور بعض دوسرے افراد کو) سعودی عرب میں پذیرائی حاصل ہوگئی ۔ ان کی کتابیں سعودی عرب کی قیمت پر ہر زبان میں بڑی تعداد میں پھیلائی جانے لگیں ۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب کی کتابوں کے بڑے پیمانہ پر پھیلنے کا خاص سبب یہی سعودی تعاون ہے ۔ حالانکہ استدلالی اعتبار سے دونوں صاحبان کی کتابیں سطحی تھیں ۔ ان کی اہمیت زیادہ تر ان کی انشاء پردازی میں تھی نہ کہ ان کی علمی حیثیت میں ۔ خریداری کی بنیاد پر یہ کتابیں کبھی نہ پھیلتیں ۔ مگر مفت تقسیم کی بنا پر وہ ہر جگہ پہنچ گئیں ۔

ایک عرب عالم اخوان سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے کافی متاثر تھے ۔ انھوں نے میرے بارہ میں کہا کہ آپ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اسلام دعوت کا نام ہے ۔ اسلام کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں ۔ پھر انھوں نے مولانا مودودی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مودودی سے پہلے اسلام صرف نماز اور عبادت کا نام تھا ۔ مودودی نے بتایا کہ اسلام ایک کامل اور شامل نظام ہے ۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ دین کو ایک ڈھانچہ کی شکل میں دیکھتے ہیں ۔ آپ نماز کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ ۔ اس لئے آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ نماز دین کا جزئی ڈھانچہ ہے اور نظام حکومت دین کا مکمل ڈھانچہ ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دین ایک معنوی حقیقت کا نام ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کا ۔ یہ ایک ہی معنوی حقیقت ہے جو مسجد میں نماز کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور سیاست میں اسلامی نظام حکومت کی صورت میں ۔

میرے فکر اور دوسروں کے فکر میں آپ کا یہ تقابل صحیح نہیں ۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ ہم دین کو ایک معنوی حقیقت سمجھتے ہیں جس کو شریعت میں تقویٰ کہا گیا ہے ۔ اور آپ نے دین کو ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھ رکھا ہے ۔ ہم دین کے احیاء کے لئے اس کی معنویت کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں ، اور دوسرے لوگ دین کے احیاء کے لئے اس کے خارجی نظام کا احیاء کرنا چاہتے ہیں ۔

طرابلس کے ہندستانی سفارت خانہ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ۔ جناب ذکر الرحمٰن صاحب

وہاں سکنڈ سکریٹری کے طور پر ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر رتن کو سفارت خانہ میں بہت باعزت مقام حاصل ہے۔ ہر ایک ان کا احترام کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا کام نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور اکثر اپنی واقعی ڈیوٹی سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں میں بیان کیا: ان قیمۃ المرء ما یحسنہ۔

آدمی جب کوئی برا کام کرے تو لوگوں کو صرف اس کی برائی یاد رہتی ہے۔ ہر آدمی اس کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب کوئی اچھا کام کرے تو وہ صرف اس اچھے کام کے واسطہ سے جانا جانے لگتا ہے۔ اس کا اچھا کام ہی اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں اگر کچھ کمتر پہلو ہیں، تو وہ سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

ایک عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے مشن سے پوری طرح واقف ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے نہایت تاثر کے ساتھ کہا کہ آپ کا یہ مشن عربوں کے لئے رحمت ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اس فکر کو اختیار کر لیں تو ان کے لئے ممکن ہو جائے گا کہ وہ انٹگریٹی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں نے عالم عرب میں جو حالات پیدا کر دیے ہیں، اس کے بعد ان کے لئے دو برائیوں میں سے ایک برائی کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یا قید یا نفاق۔ اگر وہ چاہیں کہ وہ اپنے موجودہ دینی خیالات کے ساتھ زندہ رہیں تو انھیں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اگر وہ سیاسی نظام کے ساتھ موافقت کر کے زندہ رہیں تو یہ ان کے لئے منافقت ہوگی۔ کیونکہ ان کے دل میں کچھ ہوگا اور عمل میں کچھ:

ان رسالتك هذه رحمة للعرب لان بهذه الرسالة هم يستطيعون أن يعيشوا بشخصية انسجامية، ففي الاحوال القائمة التي توجد في العالم العربي اليوم بسبب الحركات الاسلامية المعاصرة، لم يبق لهم الا الاختيار بين الشرين، اما السجن واما النفاق. حيث انهم اذا ارادوا ان يعيشوا طبقاً لشاعرهم الدينية عُذّبوا وان ارادوا ان يعيشوا وفق النظام بنافقوا!

ایک عرب ملک کے متعلق مجھے معلوم ہوا۔ وہاں ایک اسلامی جماعت کے افراد گھریلو انداز پر اپنا اجتماع کیا کرتے تھے۔ اس پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ بعد کو ان لوگوں نے ذمہ داروں

سے مل کر اس کی اجازت حاصل کر لی۔ مگر یہ اجازت انھیں صرف اس وقت ملی جب کہ انھوں نے اقرار کیا کہ ان کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ یہ اقرار ان کے تصور دین کے مطابق سراسر خلاف واقعہ تھا۔ کیوں کہ ان کا جو تصور اسلام ہے اس کی بنیاد ہی سیاست پر قائم ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد شہادت علی الناس ہے۔ یعنی خالص دعوتی انداز میں وہ کام کرنا جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے۔ یہ ازاول تاآخر ایک فکری مہم ہے، اس کا کوئی تعلق جنگ اور قتال سے نہیں۔ حتی کہ فریق ثانی اگر اشتعال انگیزی کرے تب بھی ہمیں ٹکراؤ سے یک طرفہ اعراض کرنا ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا باقی رہے۔ مسلمان اگر اس کام کو نہ کریں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

اس سلسلہ میں میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۲ میں چین نے آسام کی سرحد پر ہندستان کے علاقہ میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) کا کمشنر اپنے دفتر سے بھاگ کر اپنے گھر آگیا۔ گھر پر اپنے بچوں کے ساتھ قیام کرنا عام لوگوں کے لئے کوئی جرم نہیں۔ مگر مذکورہ کمشنر کے لئے یہ چیز جرم بن گئی۔ کیوں کہ اس نے اپنی ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ جب کسی آدمی کو کسی خاص ڈیوٹی پر مقرر کیا جائے تو اس کی ساری قیمت اس ڈیوٹی کے مقام پر ہوتی ہے۔ کسی اور مقام پر بظاہر وہ کوئی درست کام کر رہا ہو تب بھی اس کے کام کی کوئی قیمت نہیں۔

اس پر ایک عرب نوجوان نے کہا کہ آپ کی مثال سے قتال کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ تیز پور کے کمشنر کی غلطی یہی تھی کہ اس نے قتال کے محاذ کو چھوڑ دیا اور غیر قتال کے میدان میں واپس آگیا۔

میں نے کہا کہ مثال کا یہ مطلب نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مثال کی دو قسمیں ہیں، ایک مثال برائے استدلال۔ دوسری مثال برائے توضیح۔ آپ کا اعتراض اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب کہ میں نے یہ مثال برائے استدلال دی ہو، حالاں کہ میں نے یہ مثال برائے توضیح دی ہے۔

جب آپ ایک نقطۂ نظر کو قرآن وحدیث سے ثابت کر دیں اور اس کے بعد ایک مثال بطور توضیح نقل کریں تو اس مثال کا صرف وہ جزء وہاں چسپاں ہوگا جو آپ کی بات سے متعلق (relevant) ہے۔ دوسرے پہلو جو غیر متعلق (irrelevent) ہیں وہ اپنے آپ حذف ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے نقطۂ نظر کو اولاً قرآن و حدیث سے ثابت کیا۔ اس کے بعد توضیح کے لئے تیز پور کے کمشنر کی مثال دی۔ اس مثال میں صرف ڈیوٹی کا پہلو میری گفت گو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ڈیوٹی کا پہلو لیا جائے گا، اور رفتار کا پہلو اپنے آپ حذف ہو جائے گا۔ میری بات کی تردید کے لئے آپ کو قرآن و حدیث سے دلیل لانی ہوگی، کیونکہ میرا ابتدائی استدلال قرآن و حدیث ہے نہ کہ کمشنر کی مثال۔

ایک عرب ملک کے کچھ عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملک وہ ہے جو عام طور پر بدنام ہے کہ وہاں جبر ہے۔ وہاں کے حکمراں بے دین ہیں۔ وہاں اسلامی کام کے مواقع نہیں ہیں۔ مگر ان نوجوانوں کا تجربہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کام کرنے والوں کے لئے ہر جگہ کام کے مواقع ہیں۔

ان عرب نوجوانوں نے راقم الحروف کی عربی مطبوعات پڑھیں اور انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان کے اندر دعوتی کام کا ذہن پیدا ہوا۔ ان کے ملک میں باہر کے ملکوں کے بہت سے غیر مسلم لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کارکن غیر مسلموں کے درمیان انھوں نے دعوتی کام کرنا شروع کیا۔ اب تک وہ بہت سے لوگوں کو اسلام میں داخل کر چکے ہیں۔

انھوں نے مجھے کچھ عربی کے فارم دکھائے۔ یہ فل اسکیپ سائز میں عمدہ کاغذ پر عمدہ چھپے ہوئے فارم تھے۔ ان میں ایک تصویر کا خانہ تھا جہاں نومسلم کی تصویر لگائی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ فارم میں مختلف خانے تھے جن کو نومسلم بھر کر اپنا دستخط کرتا تھا۔ یہ فارم اس ملک کی حکومت نے نومسلموں کے لئے چھپوا رکھے ہیں۔ مذکورہ نوجوانوں نے سرکاری دفتر سے ربط قائم کر کے یہ فارم حاصل کئے اور اسلام قبول کرنے والوں پر اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔

اس طرح ایک بدنام ملک میں آزادانہ طور پر ایک دینی کام انجام پا رہا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دینی کام وہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

ایک عرب نوجوان عمر الہادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک عرب یونیورسٹی میں میڈیکل سائنس کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ انگریزی اور مرکز کی عربی مطبوعات کو پڑھ کر ان کے اندر دعوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنی یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں سے انھوں نے ربط قائم کیا۔ اور ان کو انگریزی کتابیں، مثلاً قرآن کا انگریزی ترجمہ، گاڈ ارائزز، پرافٹ آف ریوولیوشن وغیرہ۔

پڑھنے کے لئے دیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے حوصلہ افزا تجربات بتائے۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ ان کی یونیورسٹی میں فزیالوجی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر "بی آر" ہیں۔ انھوں نے پروفیسر موصوف کو کتابیں پڑھائیں۔ پڑھنے کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے عمر الہادی سے کہا کہ میرے بیٹے، یقین کرو، اگر تم نے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے پہنچا دیا، تو تم دیکھو گے کہ دنیا کے ۹۰ فیصد لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے:

My son, believe me, if you can introduce this truth to the world as you have done to me, you will see that 90% of the world will become Muslim.

نائجیریا کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام نمدی (Namdi) بتایا۔ ان کی تعلیم بیرونی ملکوں میں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا خاندان مسلمان ہے۔ مگر مجھے مسلمانوں کی اس بات سے سخت اختلاف ہے کہ وہ لڑائی (جہاد) کو بہت زیادہ گلوریفائی کرتے ہیں۔ میں کسی بھی قسم کی لڑائی کے سخت خلاف ہوں۔ اسلام اگر سچا مذہب ہو تو وہ لڑائی کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس معاملہ میں اپنے خاندان سے میرا اتنا اختلاف ہوا کہ میں نے خاندان کو چھوڑ دیا۔ اسلام اگر یہی ہے تو میں اس کو نہیں مانتا۔

میں نے سوچا کہ انسان کی فطرت ایسا دین چاہتی ہے جس میں امن ہو۔ مگر موجودہ مسلمانوں کے ماحول میں اس کو ایسا اسلام نہیں ملتا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اسلام جنگ کا مبلغ ہے۔ وہ اپنی فطرت کی آواز پر چلے تو اس کو اپنے مسلم خاندان کو چھوڑنا پڑتا ہے، وہ اگر خاندان پر چلے تو اپنی فطرت کو۔

عرب اخبارات میں آجکل روزانہ دعوت اسلام اور قبول اسلام کی خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً طرابلس کے اخبار الدعوۃ الاسلامیہ کے صرف ایک شمارہ (۲۱ مارچ ۱۹۹۰) میں اس قسم کی کئی خبریں موجود تھیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے سات سال میں ہانگ کانگ کے سات ہزار باشندوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے (۷ آلاف مواطن فی هونج كونج يشهرون اسلامهم فی سبعة اعوام)

شوشہ نہ کہ حقیقت

ایک خبر پڑھی۔ یہ خبر انگریزی اخباروں میں مختصر طور پر اور قومی آواز (یکم فروری ۱۹۹۰) میں زیادہ تفصیل کے ساتھ چھپی ہے۔ جین مت کے مشہور پیشوا اچاریہ منی سوشیل کمار وشو ہندو پریشد کے سات بانیوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کے جھگڑے کو پُر امن طور پر طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے افراد شریک ہیں۔

"منی سوشیل کمار جی ۲۴ جنوری ۱۹۹۰ کو اپنی کمیٹی کے ۱۲ ممبروں کے ساتھ اجودھیا پہونچے۔ انھوں نے اجودھیا کی "متنازعہ عبادت گاہ" کا تقریباً ایک گھنٹہ تک تفصیلی معائنہ کیا۔ معائنہ کے دوران کمیٹی کے افراد نے اس پر خصوصی توجہ دی کہ عمارت کے دروازہ پر لگے ہوئے کتبہ میں لفظ "مسجد" موجود نہیں۔ جین منی اچاریہ سوشیل کمار اور ان کی ٹیم یہاں خیر سگالی کے لیے اور حقائق معلوم کرنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بابری مسجد کے بیرونی اور اندرونی حصہ کو دیکھا۔ متنازعہ عمارت کے دروازہ پر لگے ہوئے پتھر میں فارسی زبان کے کتبہ کا جین منی اور ان کی ٹیم نے خصوصی معائنہ کیا۔ مبینہ طور پر اس کتبہ میں لفظ "مسجد" کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جین منی نے اپنے ساتھ آنے والے ماہرین سے سوال کیا کہ اس کتبہ میں مسجد کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی کیا وضاحت کی جاسکتی ہے۔ ماہرین نے اس نکتہ کو اہمیت دی"

رائے قائم کرنے کا یہ انداز نہایت غلط ہے۔ یہ حقائق کو چھوڑ کر شوشہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنا ہے۔ بدقسمتی سے یہ انداز موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ عام ہے۔ وہ مسلمانوں میں بھی اتنا ہی زیادہ پایا جاتا ہے جتنا غیر مسلموں میں۔

اس ذہنیت کا سب سے زیادہ مظاہرہ اختلافی معاملات میں ہوتا ہے۔ زید کو اگر بکر کی ذات سے اختلاف وعناد پیدا ہو جائے تو اس کے بعد بکر کی زندگی کے تمام قابل ذکر پہلو اس کے لیے ناقابل ذکر اور غیر اہم بن جائیں گے۔ اب زید کی نظر میں ساری اہمیت صرف ایک فرضی شوشہ کو ہو جائے گی جو اتفاق سے وہ بکر کی زندگی میں پالے۔

یہ طریقہ جس طرح، بابری مسجد کے معاملہ میں غلط ہے اسی طرح وہ دوسرے معاملات میں بھی غلط ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی برا ہے جتنا ہندوؤں کے لیے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۶۳

۱۔ صدر اسلامی مرکز نے مارچ ۱۹۹۰ میں کچھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اس سفر کے ذیل میں بہت سے لوگوں سے گفتگو ہوئی اور خطابات کے مواقع ملے۔ سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲۔ انگلینڈ کی برمنگھم یونیورسٹی میں ایک شعبہ ساؤتھ ایشین ریسرچ اسٹڈیز کے نام سے قائم ہے۔ اس کے ایک انگریز پروفیسر سی ڈبلیو نارتھ (C.W. North) ۸ مارچ ۱۹۹۰ کو اسلامی مرکز میں آئے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ وہ کئی گھنٹہ مرکز میں رہے۔ جاتے ہوئے انھیں مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

۳۔ غیر مسلم صاحبان کثرت سے اسلام کو سمجھنے کے لئے مرکز سے رجوع کر رہے ہیں۔ مثلاً ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ کو مسٹر پاریش ناتھ (ڈائرکٹر دہلی پریس پترا کیا لمیٹڈ) صدر اسلامی مرکز سے ملے اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات کیں۔ ان کو الرسالہ انگریزی کے کئی شمارے برائے مطالعہ دئے گئے۔ مسٹر ڈبلیو دھمیکا (بودھ گیا، بہار) نے الرسالہ انگریزی کا ایک شمارہ پڑھا۔ اس کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ اس کو مستقل اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ وہ الرسالہ انگریزی کی بابت اپنے خط میں لکھتے ہیں:

I found indeed, it is very interesting and very helpfull for the present day world. (Wilbagedara Dhammika)

۴۔ جاپانی اخبار سیکائی نپو (Sekai Nippo) کے نمائندہ مسٹر کونیو نیشی (Kunio Nishi) ۳۰ مارچ ۱۹۹۰ کو دوسری بار مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھے۔

۵۔ جناب اقبال احمد صاحب (مراد آباد) نے بتایا کہ انھوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ کو جامعہ ملیہ (دہلی) میں داخل کرایا۔ وہاں ان کو ہاسٹل کا کمرہ بھی مل گیا۔ مگر صاحبزادہ کا دل نہیں لگا اور ایک مہینہ کے بعد وہ اپنا سامان لے کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔ پوچھا گیا تو بتایا کہ میرا دل وہاں پڑھنے میں نہیں لگتا۔ اقبال احمد صاحب نے ان سے کچھ اور نہیں کہا۔

انھوں نے اپنی الماری سے الرسالہ کا ایک شمارہ (مئی ۱۹۸۲) نکالا اور کہا کہ اس کو پڑھ ڈالو اور کئی بار پڑھو۔ چند دن تک صاحبزادہ اس پرچہ کو پڑھتے رہے۔ اس کے بعد خود کہا کہ میں دہلی جا رہا ہوں۔ وہ دوبارہ آکر محنت سے پڑھنے لگے۔ اس طرح بہت سے لوگ الرسالہ کے ذریعہ اپنے بچوں کی تربیت کر رہے ہیں۔

۶۔ عرب ملکوں میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ غیر مسلم لوگ رہتے ہیں جو پٹرول اور دوسرے شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان انگریزی الرسالہ اور مرکز کی دوسری انگریزی مطبوعات کے ذریعہ اسلام کی دعوت پہنچائی جا رہی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے بعد اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ لوگ مزید انگریزی لٹریچر کی مانگ کر رہے ہیں۔

۷۔ الرسالہ کے مضامین مسلم اخبارات و رسائل کے علاوہ غیر مسلم پریس میں بھی برابر چھپ رہے ہیں۔ مثلاً نئی دہلی کا انگریزی پرچہ لوکائن بلیٹن (مئی ۱۹۹۰) نے الرسالہ انگریزی کا ایک آرٹیکل دوبارہ پورے حوالہ کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس طرح الرسالہ کی آواز وسیع تر حلقہ میں پہنچ رہی ہے۔

۸۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ ان کے لڑکے یورپ اور امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا وہاں کام کرتے ہیں، وہ ہندستان میں انگریزی الرسالہ خریدتے ہیں اور اس کو پڑھنے کے بعد یورپ اور امریکہ میں اسے اپنے لڑکوں کو بھیج دیتے ہیں۔ ایسا بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام اپنے خریداروں کے ذریعہ بہت سے ملکوں میں پہنچ رہا ہے۔

۹۔ اپریل ۱۹۹۰ میں صدر اسلامی مرکز کی دو تقریریں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئیں۔ ایک تقریر ۱۹ اپریل کو اور دوسری تقریر ۲۶ اپریل کو۔ دونوں تقریریں اخلاقی اور اصلاحی نوعیت کی تھیں۔ ان کو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ ان تقریروں کے عنوانات یہ تھے: انتقام نہیں، اور حقیقت پسندی۔

۱۰۔ بدرالدین احمد صاحب (مراد آباد) اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اکثر سفر کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیگ میں الرسالہ کے کچھ شمارے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ وہ راستہ میں لوگوں کو

الرسالہ پڑھاتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی واقعے بتائے۔ مثلاً وہ مراد آباد سے دہلی آرہے تھے۔ راستہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی جو ایک ہائر سکنڈری اسکول میں استاد ہیں۔ انھوں نے ان کو الرسالہ جنوری ۱۹۹۰ دیا اور کہا کہ پہلے اس کا مضمون ایک نمونہ (صفحہ ۲۳) پڑھئے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا "میں نے آج تک کسی عالم کو نہ پڑھا اور نہ دیکھا جو مسلمانوں کو اس طرح کی باتیں بتائے۔ یہ ایک منفرد رسالہ ہے۔ اب تک میں اس سے واقف نہ تھا۔ اب میں اس کو برابر پڑھوں گا۔ اس طرح وہ تقریباً دس سال سے کر رہے ہیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو الرسالہ کا قاری بنایا ہے۔ وہ ہندو مسافروں کو بھی پڑھاتے ہیں اور مسلم مسافروں کو بھی۔ غیر اردو دانوں کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

۱۱۔ ایک صاحب الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے بچے انگریزی درس گاہوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ اردو سمجھتے ہیں مگر وہ اردو پڑھ نہیں سکتے۔ انھوں نے بتایا کہ جب الرسالہ آتا ہے تو میں اپنے بچوں کو بٹھاتا ہوں اور ان کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ الرسالہ کے دوسرے بہت سے قاری بھی اپنے گھروں میں ایسا ہی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ مولانا مقبول احمد مفتاحی (اجرا، مدھوبنی) جامع مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہر ہفتہ وہ جمعہ کے خطبہ سے پہلے آدھ گھنٹہ تقریر کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر الرسالہ سے اصلاحی باتیں لے کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ مختلف مقامات پر مسجدوں کے ذریعہ الرسالہ کا تعمیری پیغام پھیلا رہے ہیں۔

۱۳۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: آپ کی کئی کتابیں میں نے پڑھ لیں۔ ان سے بہت متاثر ہوں۔ دین کامل جیسی ایمان افروز اور ولولہ انگیز کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ اور وہ اپنے ماننے والے کو کیا بنا دیتا ہے۔ اس کو سمندر کا اضطراب اور ساحل کا سکوت عطا کرتا ہے۔ الرسالہ برابر مل رہا ہے۔ پڑھ کر عجیب روحانی کیف محسوس کرتا ہوں۔ فکر و تدبر کی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ سچ ہے از دل خیزد بر دل ریزد۔ (بدر جمال اصلاحی، سرائمیر، اعظم گڈھ)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

RNI 28822/76 □ July 1990 No 164 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	Rs 150/-
〃 〃 جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبرِ انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمتِ قرآن	25/-
دینِ کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہورِ اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	55/-
صراطِ مستقیم	35/-
خاتونِ اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہِ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدیدِ دین	
اسلام دینِ فطرت	5/-
تعمیرِ ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیاتِ اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیاتِ طیبہ	5/-
باغِ جنت	5/-
نارِ جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیرِ ملت	25/-
نمبر ۶ سنتِ رسولؐ	25/-
نمبر ۷ میدانِ عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

DELHI POSTAL Regd No D(SE) 243
U(SE) 12/86